توشی ہیکو ازتسو

اچھے اور برے کے لیے قرآنی الفاظ

(ترجمہ محمد خالد مسعود)

"قدیم عرب اقدار اور اسلام"

ابھی تک ہم زندگی کے بنیادی اصولوں کے بارے میں اسلام اور جاہلیت کے مابین جو اساسی تضاد موجود ہے' اس کو واضح کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم یہ بڑی ناانصافی ہو گی کہ جاہلی دور اور خود اسلام کے موقف کے بارے میں بھی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اسلام نے قبل از اسلام عرب کی تمام اخلاقی اقدار کو عقیدۂ توحید کے ناموافق قرار دیتے ہوئے' بلاتفریق رد کر دیا تھا۔ قدیم عرب تصور کائنات اور قرآن کے نقطۂ نظر میں ایک قسم کا تسلسل یقیناً دکھائی دیتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے کہ ان دونوں میں فرق بہت واضح ہے۔ یہ بات خاص طور پر اخلاقی صفات کے میدان میں بہت عیاں ہے۔ اس باب میں ہم اسی مسئلے پر غور کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے اہم پہلوؤں میں اسلام کا راستہ قدیم مشرکانہ جاہلیت سے بالکل الگ تھا لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جاہلی بت پرستانہ رسوم و رواج پر شدید تنقید کے باوجود قرآن کریم نے زمانۂ جاہلیت کی بہت سی ممتاز اخلاقی اقدار کو اپنایا اور انہیں ایسی نئی شکل میں دوبارہ زندہ کیا جو عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔ کسی حد تک ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ اسلام کا اخلاقی پہلو قدیم عرب اقدار اور بدوی فضائل کی بحالی ہے جو طلوع اسلام کے وقت ملک کے دولت مند تاجروں کے ہاتھوں زوال پذیر ہو چکے تھے۔

اس سلسلے میں یہ ذکر بے حد اہم ہے کہ بعد کے مسلم سیرت نگاروں کے ہاں حضرت محمد ﷺ کی جو تصویر ملتی ہے' وہ اکثر صحرائے عرب کے مثالی بطل جلیل کی ہے۔ یہ بات بھی بے حد دلچسپ ہے کہ کتب حدیث میں حضرت محمد ﷺ کے جو ذاتی فضائل بیان ہوئے ہیں' وہ قبل از اسلام شعراء کے دیوانوں کے ممدوح کی صفات کے عین مطابق ہیں جو بدوی اقدار کے حامل ہیں۔ مثلاً حضرت ابو طالب کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا بیان جسے ابن ہشام نے اپنی سیرہ میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اجود الناس كفا واجرء الناس صدرا و اصدق الناس لهجه واوفى الناس ذمه والينهم عريكه واكرمهم عشره من رأه بديهه هابه ومن خالطه احبه' ليقول ناعته: لم ارقبله ولابعده مثله"(۱)

وہ انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض تھے' سب سے مضبوط دل والے' سب سے زیادہ زبان کے سچے' اپنے وعدوں کے پورا کرنے میں سب سے زیادہ پکے' بے حد متین اور سنجیدہ اور دوستانہ گفتگو میں بہت زیادہ شریف تھے۔ جو آپ کو پہلی دفعہ دیکھتے وہ خوف کھاتے لیکن جو ان سے بہت زیادہ ملتے جلتے' وہ ان سے محبت کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسے مثالی شخص کی تصویر کشی ہے جس میں عرب جاہلیہ کے اخلاقی احساس کے خلاف کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

بہرکیف قرآن کریم میں ہمیں صحرا کی بہت سی اخلاقی اقدار کا ذکر ملتا ہے۔ جن کو نیا اسلامی رنگ دے دیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں سب سے اعلیٰ اخلاقی قدر مروہ (مروت' مردانگی) تھی اور یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس صفت میں فیاضی' بہادری'

(۱) ابن ہشام: سیرۃ النبی' ج ۲' ص ۸-۹

حوصلہ، صبر، اعتماد اور سچائی جیسی صفات اسی ایک قدر سے وابستہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں بہت تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو انہی صفات کی تلقین کی گئی ہے۔ تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے ان صفات کو بطور بدوی صفات کے دوبارہ زندہ یا بحال نہیں کیا بلکہ ان صفات کو اخلاقی تعلیمات کے ایک نظام میں ڈھال کر اسلام نے زیادہ پاکیزہ بنایا اور تازہ زندگی دی تاکہ ان سے حاصل شدہ قوت ان نئے مقاصد میں صرف کی جا سکے جو اسلام نے متعین کیے تھے۔ علم اللغات کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاہلی زمانہ کی کلیدی اخلاقی اصطلاحات ایک خاص معنویاتی تغیر کے عمل سے گذریں۔

معنویاتی تجزیے کے لحاظ سے ان الفاظ میں سے بعض کے معانی میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی، بعض کے معنی محدود کر دیئے گئے اور بعض کو کلیتاً نئی جہت دی گئی۔ بہرصورت قرآنی تعلیمات کی رو سے مروت کے قدیم تصور میں سے اس کی ایسی تمام اضافی شکلوں کو خارج کر دیا گیا جو نقصان دہ تھیں اور اب اسے ایک بہتر اور مزید مہذب شکل دے دی گئی۔ نئی مسلم معاشرت میں اس تبدیلی سے نئی اخلاقی قوت پیدا ہوئی اور یقیناً اس سے اسلامی اخلاقی ثقافت کو ایک مخصوص رنگ ملا۔

فیاضی

ہم بحث کے آغاز کے لیے فیاضی کی صفت سے بات شروع کرتے ہیں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ فطری طور پر صحرائی زندگی میں اعلیٰ انسانی صفات کی فہرست میں خیرات کا جذبہ اور فیاضی انتہائی اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ صحرا میں جہاں زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی بے حد کمیاب ہیں، مہمان نوازی اور باہمی تعاون یقیناً زندگی کی بقا کی جدوجہد کا ایک بنیادی عنصر ہیں۔ لیکن بات اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جاہلی عربوں کے ذہن میں فیاضی کا تعلق جاہلی عزت اور آبرو کے تصور سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کا شاعر زھیر بن ابی سلمیٰ کہتا

ہے:

ومن يجعل المعروف من دون عرضه
يفره ومن لا يتق الشتم يشتم[1]

جو احسان کو اپنی آبرو کے لیے آڑ بنائے گا تو اس کی عزت و آبرو میں اضافہ
ہو گا اور جو دوسروں کو گالی دینے سے نہ بچے گا' اسے بھی گالی دی جائے گی۔

فیاضی کے کام انسان کی عالی نسبی کا ثبوت سمجھے جاتے تھے۔ کوئی شخص فیاضی کے معاملے میں جتنا زیادہ اسراف اور بے سوچے سمجھے خرچ کرنے کا مظاہرہ کرتا تھا' اس کی اتنی ہی زیادہ تعریف ہوتی تھی۔ ایک جاہلی عرب کے لیے خیرات اس کی عصبیت کے جذبے کا فطری اظہار ہی نہیں تھا بلکہ خیرات ان لوگوں کے لیے بھی تھی جو اس کے قبیلے کے افراد نہ ہوں بلکہ ایسے غیر لوگ بھی جو خیرات کے وقت سامنے موجود ہوں۔ نہ ہی فیاضی محض نرم دلی اور رحم کے جذبے کا مظاہرہ تھا۔ یہ اول اور آخر مردانگی کا مظاہرہ تھا۔ جو شخص فیاضی کا شاہانہ مظاہرہ کرتا تو صحرا کا سب سے زیادہ محبوب شخص سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ فیاضی ان معنوں میں عربوں کا سب سے غالب جذبہ تھا۔ یہ ایک اخلاقی خوبی سے زیادہ ایک ایسا اندھا اور بے اختیار جذبہ تھا جو عربوں کے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں زمانۂ جاہلیت کے شاعر بہت زیادہ شراب نوشی کی عادت کو فخریہ خالص فیاضی کی ایسی صفت کے طور پر بیان کرتے تھے جو کہ عالی نسبی کا ثبوت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے اشعار میں ایک عالی نسب شخص کبھی کل کی فکر نہیں کرتا۔ اس تعریف کا صحیح مطلب یہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو فیاضی محض شہرت کی خوشی کے لیے کرنی چاہیے تاکہ دیکھنے والوں کے دلوں میں اس کے لیے انتہائی تعریف کے جذبات ابھریں۔ یہ تعریف صرف مہمان ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی کریں۔ چنانچہ فطری طور پر یہ فیاضی

(۱) المعلقات السبع: معلقه زہیر (ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین) (کراچی: نور محمد کارخانہ تجارت کتب' ت ن) ص ۴۴
[مترجم]

بے سوچے سمجھے شاہ خرچی کے مترادف تھی۔ حاتم طائی جسکے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں یقینی طور پر بدوی فیاضی کی مجسم مثال ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قدیم عربی زبان میں کریم صفت عالی نسبی اور فیاضی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں کریم وہ شخص ہے جسے ہر شخص اس لیے عالی نسب اور شریف مانتا ہو کہ اس نے بے حد و حساب فیاضی کے ذریعے اپنی عالی نسبی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کریم کے اسم صفت میں اس معنویاتی عنصر (اسراف) کو کس طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے' اور اسے خوف خدا اور تقویٰ کے حوالے سے کس طرح نئے معنی عطا کیے ہیں۔

بنیادی طور پر اسلام کا نقطہ نظر وہی ہے جو قدیم جاہلی عربوں کا تھا۔ یعنی زمانۂ جاہلیت کی طرح اسلام بھی خیرات کو ایک اعلیٰ قدر تسلیم کرتا ہے۔ دونوں یکساں طور پر فیاضی کو ایک اہم صفت گردانتے ہیں۔ البتہ اسلام نے اس صفت کو نئی مذہبی سیاسی معاشرت کا معاشی اصول بنا کر صریحاً یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبی اسلام میں زیادہ اعلیٰ قدر کی حامل ہے۔ علاوہ ازیں بدوی فیاضی کی قدر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسلامی عقیدے کے خلاف یا ناموافق ہو۔

ولست بحلال التلاع مخافه
ولكن متى يسترفد القوم ارفد[1]

میں کسی کے ڈر سے ٹیلوں پر فروکش ہونے والا نہیں ہوں' مگر جب قوم مجھ سے مدد مانگتی ہے تو میں اس کو مدد دیتا ہوں۔

یہ شعر جاہلی شاعر طرفہ کے فخر کا اظہار ہے۔ یہاں ڈر کا اشارہ دراصل مہمانوں کی طرف ہے جو اس کے خیمے میں مہمان نوازی کی توقع سے آئے ہوں۔ مسلمانوں کی نظروں میں بھی ایسا رویہ اتنا ہی قابل احترام اور قابل تعریف ہے۔ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح گو حضرت حسان بن ثابت بھی آپ کی تعریف ایک ایسے شخص کی مانند کرتے ہیں جو

(۱) المعلقات السبع: معلقه طرفه' محولہ بالا' ص ۶۲

اپنے اموال کو بے حد فیاضی سے خرچ کرتا ہے۔ خواہ وہ اس کے اپنے ہوں یا موروثی۔ تنگی کے زمانے میں بھی جب بہت زیادہ فیاض شخص بھی اپنے مال کو روک لیتا ہے' آپ فیاضی سے کام لیتے ہیں۔[1]

ان دونوں مثالوں میں صرف ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے فیاضی کے ایسے تمام اعمال جو دکھاوے کے لیے کیے جائیں رد کر دیئے۔ مردانگی یا شہرت جو کسی مقصد کے بغیر ہو وہ محض ایک شیطانی حرص و ہوس ہے۔ فیاضی بجائے خود اہم نہیں بلکہ اہمیت اس جذبے کو ہے جو فیاضی کو جنم دیتا ہے۔ فیاضی کے ایسے تمام کام جو فخر و غرور کے لیے کیے جائیں' بے قیمت ہیں۔

"یا ایها الذین آمنوا لاتبطلوا صدقٰتکم بالمنّ والاذی کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولایومن بالله والیوم الآخر فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا لایقدرون علی شیئ مما کسبوا والله لایهدی القوم الکفرین "(البقره : ٢٦٤)

مومنو! اپنے صدقات کو احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا' تو اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ یہ لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ فیاضی ایک اخلاقی صفت ہے لیکن یہ اخلاقی صفت جب اسراف کی حد کو پہنچے تو برائی بن جاتی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو شخص

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام

ایسا کرتا ہے اسے واضح طور پر کافر کہا گیا ہے۔ ایک اور آیت میں شاہ خرچ کو بڑی صراحت سے شیطان کا بھائی بتایا گیا ہے۔

"ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین وکان الشیطن لربہ کفورا" (الاسراء: ۲۷)

بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

کنجوسی یقیناً قابل مذمت ہے اور ایک اخلاقی نقص یا برائی ہے لیکن حد سے زیادہ خرچ کرنا بھی ایک اخلاقی نقص ہے۔ ہمیشہ درمیان کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ مومنوں میں سے ان کے ذاتی اموال کے بارے میں یہی ضابطہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"ولا تجعل یدک مغلولہ الی عنقک ولاتبسطھا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انہ کان بعبادہ خبیراً و بصیراً" (الاسراء: ۲۹-۳۰)

اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے باندھ لو اور نہ بالکل ہی کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ' بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے' وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور دیکھ رہا ہے۔

"والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما" (الفرقان: ٦٧)

اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں' بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔

فیاضی کو صحیح معنوں میں اسلامی قدر بنانے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ بے سوچے سمجھے کام کرنے کا داعیہ جو زمانہ جاہلیت کا مخصوص رویہ تھا ختم کر دیا جائے۔ ایسا

شخص جو اپنے تمام اونٹوں کو فوراً (دعوت کے لیے) ذبح کر دے اور ایک لمحہ رک کر بھی نہ سوچے کہ اسے یا اس کے خاندان کو کس طرح افلاس یا غربت کا مستقبل میں سامنا ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص زمانہ جاہلیت میں مروہ اور کرم کی مثال تو ہو سکتا ہے لیکن اسلام میں اسے صحیح فیاضی کا عمل نہیں سمجھا جاتا۔ صحیح فیاضی یہ ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں اپنا مال صرف کرے یعنی اس کا فیاضی کا جذبہ نیک ہو۔[1] نیکی کے جذبے پر بنیاد رکھنے سے یہ ایسی صفت بن جاتی ہے جو ضبط اور قابو میں رہتی ہے۔ اسلام کا جذبہ فیاضی زمانہ جاہلیت کے عربوں کے شیخی اور اسراف کی فیاضی کے عمل سے بے حد مختلف ہے۔ چنانچہ اسلام نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی تاکہ وہ فیاضی کے فطری جذبے کو نہایت مناسب طریقے سے اپنا سکیں۔ اور فخر و غرور اور اسراف کے شیطانی جذبات سے بچ سکیں۔ فیاضی کا جذبہ جو عرب کی روح کی گہرائیوں میں موجود تھا' زکوٰۃ و خیرات نے اس کے لیے ایک ایسا مصرف فراہم کیا جو ایک بہتر بدل بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی فاضل قوت کو منظّم کرنے کا بہت بڑا وسیلہ بھی۔

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی حکومت میں خیرات بہت جلد ایک قانونی ٹیکس کی شکل اختیار کر گئی جو زکوٰۃ کے نام سے معروف ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ یہ نظام آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ تاہم قرآن کریم میں ہمیں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا کہ زکوٰۃ کتنی اور کس طرح ادا کی جائے۔ قرآن کریم میں مومنوں کو خیرات کی بار بار تلقین کی گئی ہے جو ایک نیکی کا کام ہے لیکن یہ حکم ذاتی اخلاقیات کے دائرے میں آتا ہے اور سماجی فرائض کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن آیات میں مومنوں کو خیرات کا حکم دیا گیا ہے' اور یہ بے حد کثیر تعداد میں ہیں' ان سب میں ہمیشہ منبع ایمان کو بطور

(۱) شریف المرتضیٰ' ج ۱' ص ۲۰۴' لکھتے ہیں کہ اپنا مال خرچ کرتے رہو۔ ثواب اسی وقت ملتا ہے جب اس کے ساتھ اللہ سے ملاقات' اس کی عبادت اور اطاعت کی نیت ہو' جب یہ چیزیں ساتھ نہ ہوں تو مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔

مصدر اور آخرت میں انعام بطور نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔

"آمنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ فالذین آمنوا منکم وانفقوا لھم اجر کبیر" (الحدید : ۷)

خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اس نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے' اس میں سے خرچ کرو' تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے' ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔

"مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبہ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلہ مائہ حبہ واللہ یضعف لمن یشاء واللہ واسع علیم۔ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لایتبعون ما انفقوا منًا ولا اذی لھم اجرھم عندربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون" (البقرہ : ۲۶۱-۲۶۲)

جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں' ان کی مثال اس دانے کی سی ہے' جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال خدا کے رستے میں صرف کرتے ہیں' پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر احسان رکھتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں' ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان کو نہ کچھ خوف ہو گا نہ غم۔

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحرانشین عربوں میں خاص طور پر بعض لوگ ایسے تھے جو بظاہر اچھے مسلمان تھے لیکن صدقات کو ایک طرح کا جرمانہ یا جبری ٹیکس سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ لوگ جو صحیح معنوں میں مسلمان تھے' وہ ان صدقات و خیرات کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

"الاعراب اشد کفرًا ونفاقًا واجدر الایعلموا حدود ما انزل اللہ

علی رسوله والله علیم حکیم ومن الاعراب من یتخذ ما ینفق
مغرمًا و یتربص بکم الدوائر علیهم دائره السوء والله سمیع
علیم ومن الاعراب من یومن بالله والیوم الآخر ویتخذ ما ینفق
قربت عندالله وصلوت الرسول الا انها قربه لهم' سیدخلهم
الله فی رحمته" (التوبه: ۹۸-۹۹)

بدوی عرب سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس لائق ہیں کہ جو احکام خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں' ان سے واقف ہی نہ ہوں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

"بعض بدوی عرب ایسے ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں' انہی پر بری مصیبت ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اور بعض بدوی عرب ایسے ہیں کہ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں' اسے خدا کی قربت اور پیغمبر کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں' بے شک یہ ان کے لیے قربت ہے اور خدا عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔"

تاہم یہاں بھی یعنی اللہ کی راہ میں بھی' بے سوچے سمجھے خرچ کرنے سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے۔ زکوٰۃ ہر مسلمان کے لیے ایک مذہبی فریضہ ہے لیکن اپنے تمام اثاثے کو بے سوچے سمجھے اس طرح خیرات کر دینا کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں افلاس کا شکار بنا ڈالے' یہ بعینہ زمانہ جاہلیت کی بے خدا معاشرت والی غلطی کا ارتکاب ہے۔ ہمارے خیال میں سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگرچہ قدیم مفسرین نے اس کے بہت سے دوسرے مطالب بیان کیے ہیں۔

"وانفقوا فی سبیل اللہ ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکه[۱]
واحسنوا[۲] ان اللہ یحب المحسنین" (البقرہ: ۱۹۵)

اور خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو' نیکی کرو'
بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اگر اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا قابل مذمت ہے تو کنجوس کہلانا اس سے بھی زیادہ مذموم بات ہے۔ بخل فیاضی کی صفت کا عین متضاد ہے۔ اسے بے حیائی اور بدنامی کا واضح ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح فیاضی کو سب سے اعلیٰ قدر سمجھا جاتا تھا اسی طرح فطری طور پر زمانہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بخل کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بخل کو ذرا سا شبہ بھی مردانگی کے تصور کے لیے قابل شرم تھا۔ مشہور شاعر زہیر کے معلقہ کا مندرجہ ذیل شعر صحرائی اخلاقیات کا خلاصہ ہے۔

ومن یک ذا فضل فیبخل بفضله
علی قومه یستغن عنه ویذمم[۳]

جس شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہو اور وہ اپنے زائد مال میں بخل
کرے تو اس سے بے پروائی کی جائے گی اور اس کی مذمت کی جائے گی۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت محمد ﷺ نے قبیلہ بنو سلمہ کے لوگوں سے پوچھا کہ ان کا رئیس کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا الجد بن قیس' اگرچہ وہ بخیل ہے۔[۴] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخل سے بڑھ کر کوئی موذی مرض نہیں ہے۔[۵]

(۱) تفسیر بیضاوی میں اس کا مطلب یوں بیان ہوا ہے: یعنی بے سوچے سمجھے خرچ کرنا' حتیٰ کہ اپنی روزی کو خطرے میں ڈال دینا۔
(۲) یعنی خرچ کرتے وقت تمہاری نیت محض نیکی کا کام کرنا ہونی چاہیے' شاہ خرچی کا مظاہرہ نہیں۔
(۳) المعلقات السبع: معلقہ زہیر' ص ۴۴
(۴) الجد کے معنی سخی کے ہیں۔ اس لیے اہل قبیلہ نے کہا کہ نام سخی ہے لیکن ہے کنجوس۔
(۵) سیرۃ ابن ہشام: ج ۲' ص ۷۷ (دای داء اکبر من البخل)۔

عین ممکن ہے جیسا کہ پروفیسر واٹ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مکہ کے امیر لوگ خاص طور پر اس مذموم طبیعت کا اظہار کرنے لگے ہوں۔[۱] اس بات کا بھی امکان ہے کہ قرآن کریم میں مکے کے تاجروں کو طعن و تشنیع کا نشانہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ بخل میں انتہائی پست درجہ تک چلے گئے تھے۔ تاہم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی صحرا میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے جو اپنے بخل اور لالچ میں مشہور رہتے۔ یہ بات کہ بہت سے شاعروں نے اپنے اشعار میں بہت زور دے کر یہ کہا ہے کہ وہ لالچ سے پاک ہیں' خود اس بات کی شہادت ہے کہ معاشرے میں یہ برائی موجود تھی۔

ایک ہم عصر عرب مصنف[۲] زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک بہت ہی عجیب و غریب نکتہ سامنے لایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری کی "کتاب الاغانی" اور دوسری روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بخل کے بارے میں عورتیں خاص طور پر بدنام تھیں۔ شواہد کی کثیر تعداد کی بنیاد پر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عام طور پر عورتیں بہت کنجوس تھیں یا کم از کم وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ کنجوس تھیں کیونکہ معاشرے میں اور گھر میں ان کی حیثیت اس بات کا تقاضا کرتی تھی۔ ان کی نظروں میں لا محدود فیاضی قابل تعریف صفت نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس یہ مردوں کی ناقابل علاج خرابی تھی۔ یہ اس لحاظ سے بھی قابل مذمت تھی کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہی یہ خاندان کی خوشی کے لیے نقصان دہ اور تباہ کن تھی۔ خواتین کے نقطۂ نظر سے فیاضانہ مہمانداری خصوصاً جب اس میں افراط ہو محض بے وقوفی تھی۔ درحقیقت قدیم شاعری میں بیویوں کو ہمیشہ اپنے خاوندوں کی برائی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے قیمتی اموال کو بے پروائی سے خرچ کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف مرد حضرات اپنی فضول خرچی اور فیاضی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

---

(۱) منٹگمری واٹ: باب سوم' ص ۷۲-۷۹

(۲) احمد محمد الحوضی: الحیاۃ العربیہ من الشعر الجاہلی (قاہرہ' ۱۹۵۲' صفحات ۲۵۲ و مابعد

ان کا محض ایک عذر ہے کہ صرف فیاضی کے ذریعے ہی وہ ابدی شہرت حاصل کر سکتے ہیں' جبکہ دولت عار اور مذمت کا باعث ہے۔

یہ بات انتہائی دلچسپ ہے کہ طلوع اسلام کے وقت امیر تاجروں کا بالکل یہی نقطۂ نظر تھا جو ہم نے زمانۂ جاہلیت کی خواتین کا بیان کیا ہے۔ مکے کی اس آبادی میں جو بنیادی طور پر تاجر پیشہ تھی مروت کی قدر اپنا اثر و رسوخ کھو چکی تھی۔ عزت و آبرو کا قبائلی احساس اب زندگی کا اصول نہیں رہا تھا۔ عزت اور آن کی بجائے اب دولت زندگی کا مقصود بن چکی تھی۔ وہی دولت جس کے بارے میں صحرائی عرب حقارت آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے شرم اور مذمت کا اظہار ہوتا تھا' اب عزت و شہرت کا واحد ذریعہ سمجھی جانے لگی تھی۔ بخل برائی کی بجائے طاقت کا اصلی ذریعہ قرار پا چکا تھا۔ فطری بات تھی کہ مکہ کے امیر لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قرآنی الفاظ میں اپنی مٹھیاں بند رکھے ہوئے تھے' اور فرض شدہ زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے میں سستی سے کام لیتے تھے' بلکہ بعض اوقات کھل کر انکار کر دیتے تھے۔ چنانچہ فطری طور پر قرآن کریم انہیں بخل کا طعنہ دیتا ہے۔

"ومنهم من عٰهد الله لئن اٰتٰنا من فضله لنصدقن ولنكونن من الصالحين فلما اٰتٰهم من فضله بخلوا به وتولوا وهم معرضون" (التوبه : ۷۵-۷۶)

"ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنی مہربانی سے مال عطا فرمائے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکو کاروں میں سے ہو جائیں گے لیکن جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور روگردانی کر بیٹھے۔"

قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں انتہائی خوفناک سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔

"ولا يحسبن الذين يبخلون بما اتهم الله من فضله هو خيرا لهم بل هو شرلهم سيطوقون ما بخلوا به يوم القيمه" (آل عمران: ۱۸۰)

جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل میں کنجوسی کرتے ہیں' وہ اسے اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں بلکہ یہ ان کےلیے برا ہے۔ قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

"والذين يكنزون الذهب والفضه ولا ينفقونها فى سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم يوم يحمى عليها فى نارجهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ماكنتم تكنزون" (التوبه: ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے تو ان کو بڑے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے جس روز ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں' کروٹوں اور پشتوں کو داغا جائے گا' یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا سو جو تم نے جمع کیا تھا' اس کا مزہ چکھو۔

ہم یہاں اس آیت میں مذکور فی سبیل اللہ کی ترکیب پر مزید گفتگو کرنا چاہیں گے۔ یہاں پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ بخل اپنے عمومی معنوں میں مذمت کا ہدف نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مخصوص مذہبی عمل کے حوالے سے قابل مذمت ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے لوگ جو اللہ کی راہ میں بخل سے کام لیتے ہیں جو لوگ زکوۃ کی ادائیگی میں اپنی کنجوس طبیعت کا اظہار کرتے ہیں' انہیں دوزخ کے ابدی عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ کیونکہ یہی کفار حضرت محمد ﷺ کی نئی دینی تحریک کے خلاف مدد کرنے اور خرچ کرنے میں بہت خوشی سے دولت صرف کرنے کےلیے تیار تھے۔ قرآن کریم کی بہت سے آیات میں اس کی شہادت ملتی ہے۔

"ان الذین کفروا ینفقون اموالهم لیصدوا عن سبیل الله"

(الانفال: ٣٦)

بے شک یہ کافر اپنے مال اس لیے خرچ کر رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔

اسلام کی جانب سے بخل کی برائی کی پر زور مذمت اور اس پر شدید عذاب کی وعید اس وقت کے معاشی حالات میں کوئی غیرمانوس یا نئی چیز نہیں تھی۔ خصوصاً صحرائی عرب بھی بخل کو برا جانتے تھے۔ بعض لحاظ سے تو یہ ایک اہم قدیم بدوی قدر کا احیاء نظر آتا ہے۔ اگر ہم جاہلی خواتین کے کنجوسی کے رویے کو سامنے رکھیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جاہلی مروت کی قدر کے خاص مردانہ پہلو کی بحالی کی کوشش تھی۔ لیکن یہ محض اس قدیم بدوی جذبے کی بحالی نہیں تھی جو لوگوں کو شاہ خرچ فیاضی سے روکنے والے تمام عناصر سے نفرت کا نام ہے۔

اسلام کی یہ خاص بات ہے کہ اس نے اس جذبے کو اپنی پرانی شکل میں بیدار نہیں کیا بلکہ ایسی شکل دی جو اس کے اپنے تقاضے کے لیے نہایت مناسب تھی۔ عرب ذہن میں بخل کے خلاف جو بے مقصد نفرت موجود تھی اس کی بجائے اسلام نے اسے ایک نیا داعیہ دیا، جس سے اسے ایک نیا رخ ملا اور ایک نئے مثالی تصور کے لیے نیا عزم ملا۔

تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ کے راستے میں بخل کی یہ مذمت انسانی مزاج کی بنیادی خصوصیت کے گہرے مشاہدے پر مبنی ہے۔ انسان فطری طور پر کنجوس اور لالچی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کے راستے میں کنجوسی انسانی روح کے اس بنیادی رویے کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں۔

"قل لو انتم تملکون خزائن رحمه ربی اذا لامسکتم خشیه الانفاق وکان الانسان قتورا" (بنی اسرائیل: ١٠٠)

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک بھی ہوتے تو خرچ کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی تو ہے ہی بڑا تنگ دل۔

اس آیت میں کنجوسی کے لیے لفظ قتور آیا ہے جس کے معنی بھی بخیل ہیں۔ یعنی ایسا شخص جو بخل کی صفات سے جانا جاتا ہے۔ ق ت ر کا مادہ فعل کی شکل میں قرآنی سورہ نمبر ۲۵ آیت نمبر ۶۷ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہاں یہ اسراف کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی بے پروائی سے اپنی دولت کو خرچ کرنا۔

"والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما" (الفرقان: ٦٧)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ ہی کنجوسی کرتے ہیں' ان کا خرچ کرنا اعتدال پر ہوتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قتر فضول خرچی کے مخالف دوسرا انتہائی سرا ہے۔ یعنی یہ کنجوسی کی انتہائی شکل ہے۔

اسی موضوع پر قرآن کریم میں ایک اور اہم لفظ شح بھی استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد انتہائی درجے کی کنجوسی یا لالچ ہے۔ اس لفظ میں ناپسندیدگی اور مذمت کے انتہائی عناصر شامل ہیں۔ یہ لفظ بخل کو ذہن انسانی کی انتہائی مذموم حالت بیان کرتا ہے۔ شح اور بخل میں فرق بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ بخل کنجوسی کے عمل کو ظاہر کرتا ہے جبکہ شح اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جو بخل کے فعل کا تقاضا کرتی ہے۔[1] قرآن کریم میں اس لفظ کے استعمال سے اس تفسیر کی تصدیق ہوتی ہے۔ بہرکیف یہ بات بے حد اہم ہے کہ قرآن کریم میں شح کا لفظ روح انسانی کی بنیادی فطرت کے حوالے سے مذکور ہوا ہے۔

---

(۱) بستانی: محیط المحیط' ج ۱' ص ۷۹: البخل: نفس المنع' الشح: الحاله النفسانیه التی تقتضی ذالک المنع

"واحضرت الانفس الشح وان تحسنوا وتتقوا فان الله
کان بما تعملون خبیراً" (النساء: ۱۲۸)
کنجوسی اور لالچ تو نفوس کے اندر موجود ہے۔ اگر تم اچھے کام کرو اور تقویٰ
اختیار کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔
"فاتقوا الله ما استطعتم واسمعوا واطیعوا وانفقوا خیراً
لانفسکم ومن یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون"
(التغابن: ۱٦)
اللہ سے جہاں تک ہو سکے ڈرتے رہو، سنو، کہنا مانو اور خرچ کرو تو تمہارے
حق میں بہتر ہو گا جو شخص نفسانی حرص سے بچا رہا، وہی کامیاب ہے۔
"والذین تبوو الدار والایمان من قبلهم یحبون من هاجر الیهم
ولایجدون فی صدورهم حاجه مما اوتوا ویوثرون علیٰ
انفسهم ولوکان بهم خصاصه ومن یوق شح نفسه فاولئک
هم المفلحون" (الحشر: ۹)
جو لوگ ان سے پہلے سکونت اور ایمان پر قائم تھے، وہ جو ان کے پاس
ہجرت کر کے آئے ان سے محبت کرتے ہیں اور انہیں جو کچھ ملتا ہے اس پر
اپنے دلوں میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور ان لوگوں کو اپنے پر ترجیح
دیتے ہیں خواہ خود فاقے سے ہیں۔ جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا رہا
وہی کامیاب ہے۔

شجاعت

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم نے فیاضی کی پرانی قدر کو نومولود مسلم معاشرت کے مذہبی ماحول میں دوبارہ زندہ کرتے ہوئے اس

مخصوص عرب جذبے کو کس طرح ایک اصلی اسلامی قدر میں تبدیل کر دیا۔ بالکل یہی بات شجاعت کی صفت پر بھی صادق آتی ہے۔ فطری طور پر صحرائی حالات میں شجاعت اور بہادری کو سب سے اعلیٰ صفت کا درجہ حاصل تھا۔ یہ مروہ کا سب سے بنیادی عنصر تھا۔ عرب سرزمین میں جہاں کی آب و ہوا اور قدرتی حالات انسانی زندگی کے لیے شدائد و مصائب کا باعث تھیں اور جہاں لوٹ مار جرم و گناہ کی بجائے اکثر موت سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہاں جسمانی قوت اور فوجی طاقت سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں ہو سکتی۔ عرب لوگوں میں قبائلی عزت جس کے بارے میں ہم کافی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں زیادہ تر طاقت اور قوت پر مبنی تھی۔ صحرا کے عربوں کے لیے خونخوار لڑائیاں خواہ ذاتی ہوں یا قبائلی' زندگی اور عزت کا دارومدار تھیں۔ یہ زمانہ بزدلوں اور کمزوروں کے لیے انتہائی مشکل کا وقت تھا۔

وما انتميت الى خور ولا كشف
ولا لئام عذاه الباس اوراع

میں کمزوروں اور نہتوں کی اولاد میں سے نہیں' نہ ہی کسی ادنیٰ درجے کے پست ہمت بزدلوں کی۔

بل ضاربين جيك البيض اذلحقوا
ثم العرانين عند الموت لذاع[1]

میں تو ان جنگجوؤں کی اولاد ہوں کہ جب ان کا سامنا ہو تو زرہوں کی قطاریں کاٹتے جاتے جو لمبی میانوں کے ساتھ تیزی سے موت کی طرف بڑھتے تھے۔

یہ اشعار ضرار بن خطاب کے ہیں جن میں بہت واضح طور پر فخر و غرور کا اظہار ہے اسی طرح زہیر کہتا ہے کہ صحرا میں جو شخص اپنے پانی کا دفاع اپنے ہتھیاروں سے نہیں کر سکتا' وہ

(۱) سیرۃ ابن ہشام' ج ۳' ص ۱۱۳

تباہ ہو جاتا ہے اور جو دوسروں کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا وہ خود زیادتی کا شکار ہو جاتا ہے۔[1] ان حالات میں بہادری اور شجاعت صرف دفاعی ہتھیار ہی نہیں بلکہ یہ ایک زیادہ مثبت اور جارحانہ قدر کا نام تھا۔ اپنے اخلاقی اصولوں کے بارے میں یہ بیان کرتے ہوئے زہیر کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی جب وہ کہتا ہے کہ "ایک جنگجو شخص کے لیے جو شیر کی طرح خونخوار ہے اپنے دشمن پر جوابی حملہ کرنا اور اس کو سزا دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو پہل کر کے جارحانہ حملہ کرنا چاہیے خواہ کسی نے بھی اس کے ساتھ زیادتی نہ کی ہو۔[2] چنانچہ جاہلی عرب لوگوں میں بہادری اور شجاعت اکثر بے رحمانہ ظلم اور خون خواری کا دوسرا نام تھا جس سے وہ قبائلی جھگڑوں میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ ہم پہلے اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ جاہلیہ درحقیقت حلم کی عین متضاد کیفیت کا نام ہے۔

جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی شجاعت قابل تعریف ہے اور بزدلی شرمناک۔ زمانۂ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی ایک انسان کے لیے یہ انتہائی شرف کی بات تھی کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ:

> "خطرات میں اس کے قدم نہیں ڈگمگائے' وہ کمزوری نہیں دکھاتا' جنگ کے میدان میں وہ دشمن کے خلاف بہادر اور دلیر ہے۔"
>
> (کعب بن مالک)

اسی طرح اگر کسی کے بارے میں مندرجہ ذیل بات کہی جائے تو زمانۂ جاہلیت کی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی کم تحقیر آمیز بات نہیں تھی' "وہ موت سے ڈر کر پیچھے ہٹے' اسی لیے ان کی ذلتی چراگاہیں مال غنیمت بن گئیں۔ انہوں نے بہت ہی ذلیل اور پست ہمت بزدلوں کا کام کیا۔" تاہم فیاضی کی صفت کی طرح اسلام میں بہادری میں بھی انتہا پسندی کے جاہلی صفات کو

---

(۱) المعلقات السبع: معلقہ زہیر' محولا بالا' ص ۳۵' ومن لم یذو عن حوضه بسلاحه یهدم ومن لا یظلم الناس یظلم

(۲) المعلقات السبع: معلقہ زہیر' ص ۳۲ جری متی یظلم یعاقب بظلمه سریعا والا یبد بالظلم یظلم

نکال دیا اور اسے خاص اسلامی صفت بنایا۔ زمانۂ جاہلیت میں گویا بہادری کا اظہار صرف بہادری کے لیے تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے عمومی جائزے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اس زمانے کے جنگجو محض اپنے بے قابو جذبے کی تسکین کے لیے جنگوں میں بے جگری سے لڑتے اور نڈر بہادری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں بہادری ایک نا قابل ضبط جذبہ تھا۔ اسلام میں ایک مخصوص تبدیلی لائی گئی۔ تاہم اس کی اصل قوت میں ذرا سی بھی کمی نہیں کی گئی۔ اب یہ ایک اندھا اور بے قابو جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک محترم اور منضبط بہادری کا نام تھا جس کا مقصد اعلیٰ مذہب حقہ کی خدمت تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ شجاعت اللہ کے راستے میں بہادری دکھانے کا نام تھا۔

"یا ایها الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظه' واعلموا ان الله مع المتقین" (التوبه : ۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں' وہ تمہارے اندر سختی پائیں' جان رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

"الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدوکم اول مره اتخشونهم فالله احق ان تخشوه ان کنتم مومنین. قاتلوهم یعذبهم الله بایدیکم ویخزهم وینصرکم علیهم ویشف صدور قوم مومنین ویذهب غیظ قلوبهم ویتوب الله علی من یشاء والله علیم حکیم" (التوبه: ۱۳-۱۵)

کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول کے جلاوطن کرنے کی تجویز کی اور انہوں نے تم سے پہلے خود چھیڑا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو' اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ان سے لڑو۔ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دے گا اور ان کو ذلیل و خوار کرے گا اور تمہیں ان پر غالب کرے گا اور

مسلمانوں میں سے بہت سوں کے دلوں کو شفا دے گا۔ ان کے دلوں سے
غصے کو دور کرے گا اور جسے منظور ہو گا توجہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑے علم
اور حکمت والے ہیں۔

صحرا میں افواہیں ناقابل یقین تیزی سے پھیلتی ہیں۔ ایک جاہلی جنگجو کے لیے یہ ناقابل برداشت شرم کی بات تھی کہ اس کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے جنگ کے میدان میں پشت دکھائی اور دشمن کے سامنے سے بھاگ نکلا۔ کیونکہ یہ صرف اس کی ذات کے لیے شرمساری کا باعث نہیں تھا بلکہ پورے قبیلے کے لیے عار کی بات تھی۔ ایک مسلمان کے لیے بھی اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے دشمن کے سامنے سے بھاگ جانا' اللہ کے دین کے خلاف سب سے مکروہ گناہ کا ارتکاب تھا۔ بھگوڑا کہلوانا اخلاقی داغ تھا جو آسانی سے مٹایا جا نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ۸ھ میں جنگ موتہ میں مسلمانوں کو اپنے کثیر تعداد دشمن سے بہت بڑی شکست کا سامنا ہوا۔ خالد بن ولید جو سیف اللہ کے لقب سے معروف ہیں' وہ ایک بہت اچھے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بے مقصد مسلمانوں کا خون بہانے سے بہتر ہے کہ پس پائی اختیار کی جائے۔ تاہم جب فوج شہر مدینہ میں داخل ہوئی تو لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا جو ان پر مٹی پھینک کر چیخ رہے تھے کہ تم بھگوڑے ہو۔ تم نے اللہ کے راستے میں بھاگنے کی جرات کیسے کی۔[1] خود رسول ﷺ بھی اپنے جذبات کو نہ روک سکے۔[2] سلمہ بن ہشام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ جب ان کی بیوی سے پوچھا گیا کہ ان کے خاوند دوسرے مومنین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کیوں نہیں آتے تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم ان کا باہر نکلنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں' لوگ شور مچاتے ہیں' بزدل تم اللہ کے راستے سے بھاگ آئے ہو' وہ اتنا شور مچاتے ہیں

(۱) سیرہ ابن ہشام' ج ۳' ص ۴۳۸

(۲) ایضاً' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا'' یہ بھگوڑے نہیں بلکہ انشاء اللہ دوبارہ حملہ کریں گے۔''

کہ وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔[1] ہمیں قرآن کریم میں بھی اسی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ اگرچہ اس میں کسی قدر رعایت بھی موجود ہے تاکہ مسلمان جنگی تدبیر کے مقاصد کے لیے پسپائی کا جواز قائم رکھ سکیں۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفاً فلاتولوھم الادبار ومن یولھم یومئذ دبرہ الامتحرفاً لقتال او متحیزاً الی فئه فقد باء بغضب من الله ومأواہ جھنم وبئس المصیر" (الانفال: ۱۵-۱۶)

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ جس نے اس دن پیٹھ دکھائی سوائے اس لیے کہ لڑائی کے لیے پینترا بدلتا ہو یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آیا ہو' تو وہ اللہ کے غضب میں آئے گا' اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

جو لوگ اللہ کے راستے میں آگے بڑھنے سے ہچکچاتے ہیں' وہ گویا اس رویہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ سچے مسلمان نہیں ہیں۔

"ویحلفون بالله انھم لمنکم وماھم منکم ولکنھم قوم یفرقون" (التوبه: ٥٦)

یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ یہ بزدل لوگ ہیں۔

ذیل کی آیات میں بہت واضح طور پر اس کی تائید کی گئی ہے کہ سچا مومن وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اپنے انسانی دشمن سے نہیں ڈرتا اور اپنی جان و مال کے ساتھ پوری طرح لڑنے کے لیے تیار رہے۔ جو شخص اللہ سے نہیں ڈرتا وہ اللہ کے راستے میں لڑائی سے بھی ڈرتا ہے۔

(۱) سیرۃ ابن ہشام' ج ۳' ص ۴۳۹

"لایستا ذنک الذین یومنون باللہ والیوم الآخر ان یجاهدوا بأموالهم وأنفسهم واللہ علیم بالمتقین. انما یستا ذنک الذین لایومنون باللہ والیوم الآخر و ارتابت قلوبهم فهم فی دیبهم یترددون" (التوبہ: ٤٤۔٤٥)

جو لوگ اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں' وہ آپ سے اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد سے رخصت نہیں مانگیں گے۔ رخصت وہی مانگتے ہیں جنہیں نہ اللہ پر ایمان ہے نہ یوم آخرت پر' ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں' وہ خود شک میں پڑے ہیں' اس لیے وہ تردد کر رہے ہیں۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اب ایک سچے مومن سے ایسی بہیمانہ شجاعت کا تقاضا نہیں کیا جاتا جس کے بارے میں جاہلی شعراء اتنے فخر و غرور کا اظہار کرتے تھے' بلکہ ایک بالکل نئی قسم کی فوجی قوت کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان کی بنیاد پر قائم ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بہادری کی نہ کوئی نظریاتی بنیاد تھی اور نہ کوئی مقصد اور جہت۔ قرآن کریم نے اسے ایک متعین سمت مہیا کی اور جیسا کہ اسلامی سلطنت کی بعد کی تاریخ سے بہت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کو اس بارے میں کامیابی ہوئی بھی کہ اللہ کے دشمنوں کے خلاف لڑائی میں مومنوں کے ہاتھ میں یہ نئی قسم کی شجاعت ایک بہت ہی کارگر ہتھیار بن گئی۔

وفاداری

زمانۂ جاہلیت کی شاعری اور رسم و رواج کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وفاداری اور بھروسہ کا بھی صحرا کی اعلیٰ اور مخصوص صفات میں شمار ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر جاہلی وفاداری کا دارومدار زیادہ تر خونی رشتے پر تھا۔ اس پر عمل زیادہ تر قبیلے کے حوالے سے ہوتا تھا اور اس محدود میدان میں وفاداری غیر مشروط اور بالا تر قدر تھی۔ اپنے رشتہ داروں کے لیے اپنی ذات کو بغیر کسی غرض کے قربان کر دینا' اپنے دوستوں کے لیے بغیر کسی لالچ کے وفاداری کا اظہار

کرنا اور اپنے وعدے کی پاسداری کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی دینا سب اسی کے مختلف اظہار تھے۔ بعض اوقات ایک معاہدے کے اثرات کا دائرہ قبیلے کی حدود سے باہر تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ بات سموءل بن عادیا کے مشہور واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ واقعہ اتنا معروف ہے کہ یہاں اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔[1] ایک موقع پر سموءل بن عادیا محصور ہو گیا تو محاصرہ کرنے والے ظالم سردار نے سموءل سے کہا کہ وہ امرؤ القیس کا زرہ بکتر اسے دے دے۔ سموءل اگرچہ امرؤ القیس کا رشتہ دار نہیں تھا لیکن اس نے وعدہ توڑنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کا اپنا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہا۔ سموءل کا نام عربوں کی زبان پر بدوی وفاداری کی مجسم مثال کے طور پر آج تک زندہ ہے۔ زہیر نے جو اشعار اس وفاداری کے بارے میں کہے' وہ ضرب المثل بن چکے ہیں۔[2]

ومن يوف لا يذمم ومن يهد قلبه

الى مطمئن البر لا يتجمجم

جو شخص وعدہ پورا کرتا ہے' اس کی مذمت نہیں کی جاتی اور جس کے دل کو نیکی کے اطمینان کی ہدایت ہو' وہ باتوں میں لڑکھڑاتا نہیں۔

وفاداری کی یہ عزت و تکریم جاہلیت سے اسلام میں پہنچی تو اس میں اصل بدوی جوش و جذبہ پوری طرح موجود رہا۔ قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ سے بہت واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ وفاداری کی صفت جو صحرائی عربوں سے مخصوص تھی' اسلام نے بھی ایک اعلیٰ اخلاقی ضابطے کے طور پر اپنائی' بلکہ اسے زیادہ شرف و تکریم کا رتبہ دیا گیا۔ تاہم دوسری بدوی اقدار کی طرح اسلام نے اس صفت کو جوں کا توں نہیں اپنایا' بلکہ اس قدیم صفت کو ایک مخصوص طریقے سے مزید ترقی دی اور اسے بہت کامیابی کے ساتھ عقیدۂ توحید کے نظام میں سمو دیا۔ وفا کی اس بدوی صفت کو دو واضح لیکن باہم مربوط جہات سے اسلامی رنگ دیا گیا۔ ایک تو خود

(۱) مثلاً دیکھیے نکلسن محولہ بالا' صفحات ۸۴-۸۵

(۲) معلقہ زہیر بن ابی سلمیٰ' محولہ بالا' ص ۴۴

مومنین کے باہمی لین دین کے حوالے سے عام سماجی معاملات میں اور دوسرے اللہ اور بندے کے درمیان عمودی تعلق کے حوالے سے مذہبی میدان میں۔

پہلا نکتہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ تفصیلات میں جانا اس لیے ضروری نہیں کہ خصوصاً عصبیت کے حوالے سے اسلام نے جو تبدیلیاں متعارف کرائیں اور جن کا ذکر ہو چکا ہے' ان کا تکرار ہو گا۔ وفا کی صفت جو خونی رشتے کے اس مخصوص شعور سے پیدا ہوئی تھی جسے قربانی کی مقدس رسم نے جنم دیا تھا دراصل قبائلی یا بین القبائلی معاملہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک ہی قبیلے کے افراد کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ جگری بندھن کا اظہار تھا۔ دوسرے یہ مختلف قبیلوں یا ان کی شاخوں کے درمیان مقدس عہد کا رشتہ تھا۔ جب دو قبیلے کسی بات پر باہم متفق ہو جائیں مثلاً دوستی' شادی یا تجارت' تو وہ دونوں مل کر کسی دیوی دیوتا کو مشترکہ قربانی پیش کرتے تھے اور اس طرح ایک مقدس معاہدہ میں بندھ جاتے تھے۔ اسلام نے قبائلی طرز زندگی کی ایسی تمام قیود اور شرائط کو ختم کر کے اس صفت کو وفاداری کی وسیع انسانی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کو قبائل کی سطح سے بلند کر کے صحیح معنوں میں انسانی قدر میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ وفا ایک ایسی اخلاقی قوت بن گئی جو کہ ایک انفرادیت پسند معاشرے میں بھی قابل عمل تھی۔

دوسرا نکتہ اس معاملے میں زیادہ اہم ہے' یعنی وفا کو مذہبی سطح پر اسلامی رنگ دینا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدوی مذہب کے تمام ان گھڑ تصورات سے بالاتر ہو کر میثاق کے مخصوص سامی تصور کو اختیار کرتے ہوئے اسے اللہ اور بندے کے درمیان باقاعدہ مذہبی بندھن کا رسمی اظہار قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ مذہب کا یہ تصور تورات قدیم سے مخصوص ہے۔ بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کے حرکت و عمل کا سب سے بنیادی اور عمومی ڈھانچہ یہوہ اور تمام بنی اسرائیل کے درمیان میثاق کا تصور تھا۔ "میں تمہارا خدا ہوں اور تم میرے بندے ہو۔" یہوہ نے یہ میثاق خود بنی اسرائیل پر اس وقت لاگو کیا جب اس نے اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو مصر سے باہر نکالا۔ قرآن کریم میں بھی

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔

"واذ نجینکم من آل فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون أبناء کم ویستحیون نساء کم وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم واذ فرقنا بکم البحر فانجینکم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون" (البقرہ:٤٩-٥٠)

اور جب تمہیں آل فرعون سے نجات دی جو تمہارے پیچھے لگے رہتے تھے سخت ترین سزاؤں کے ساتھ۔ تمہارے بیٹوں کے گلے کاٹتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری امتحان تھا اور جب تمہارے لیے سمندر کو شق کر دیا اور تمہیں بچا لیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔

ہر معاہدہ' معاہدہ ہونے کے لحاظ سے فریقین کو کچھ باتوں کا پابند کرتا ہے۔ یہوہ نے جب اپنے لوگوں پر اپنا میثاق نافذ کیا تو اس عمل سے اپنے کو بھی معاہدے کی شرائط پوری کرنے کا پابند بنایا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کا خدا رہے گا' ان سے محبت کرے گا' ان کو نجات دے گا' ان کو صحیح راستہ دکھائے گا۔ یہ ساری باتیں اس جملے میں موجود ہیں کہ وہ ان لوگوں کا خدا رہے گا۔ یاد رہے کہ

"لا یخلف اللہ وعدہ ولکن اکثر الناس لایعلمون" (الروم:٦)

اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔

اس طرح یہوہ اور بنی اسرائیل دونوں نے اپنے آپ کو حقوق اور فرائض کے باہمی روابط میں پابند کر لیا۔ یہ انتہائی اہم بات ہے کہ یہوہ اور بنی اسرائیل کے درمیان اس بنیادی رشتے کا قرآن کریم میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا

بعهدی اوف بعهدکم وایای فارهبون (البقره: ٤٠)

اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم نے یہوہ اور بنی اسرائیل کے درمیان اس مخصوص رشتے کو اسلام کا مرکزی تصور بنایا اور اللہ اور مسلمانوں کے درمیان تعلق کے لیے اسے بنیادی شکل عطا فرمائی۔

ان الذين يبايعونک انما يبايعون الله' يدالله فوق ايديهم فمن نكث فانما ينكث على نفسه ومن اوفى بما عٰهد عليه الله فسيوتيه اجرا عظيما (الفتح: ١٠)

جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ جو شخص بد عہدی کرے گا تو یہ بد عہدی اسی پر ہو گی اور جس نے اللہ سے کیا وعدہ پورا کیا تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے بہت بڑا اجر دے گا۔

مذہب کا یہ تصور کہ وہ فریقین کے مابین ایک معاہدہ پر مشتمل ہے' صرف قدیم تورات ہی میں نہیں ہے بلکہ قرآن کریم میں بھی اس کے مخصوص تصور کے طور پر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تمام اخلاقی اقدار براہ راست یا کم از کم بالواسطہ یثاق کے اسی تصور سے تعلق رکھتی ہیں۔ صدق کی صفت ان صفات میں غالباً اولین صفت ہے جو اس بنیادی تصور سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔

صدق

ص د ق کا مادہ قرآن کریم میں کئی شکلوں میں آیا ہے۔ فعل کی صورت میں

صدق اسم کی صورت میں صدق' اسم فاعل کی صورت میں صادق اور اسم تفضیل کی صورت میں صدیق وغیرہ۔ ہم اس کی وضاحت قدیم عرب ماہرین لغت کی اس متفقہ رائے سے شروع کر سکتے ہیں کہ صدق کذب کا براہ راست متضاد ہے۔ ابن فارس بن زکریا جنھوں نے سب سے پہلی حروف تہجی کی لغت مرتب کی وہ اس لفظ کے بنیادی معنی زبان یا دوسری اشیاء کی قوت اور سختی بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اصلی معنی اس مادے سے حاصل شدہ اسم صفت' صدق میں ابھی تک پائے جاتے ہیں جس کا معنی ہے سخت اور جاندار' صدق زبان کی سچائی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہی اس کی طاقت ہے۔ اس کے مقابلے میں جھوٹ کی کمزوری ہے۔[۲]

چنانچہ صدق کا عمومی معنی سچ بولنا' صحیح خبر دینا ہے جس کا مطلب ہے حقیقت سے مطابقت رکھنا۔ لفظ کا یہ مفہوم بہت ہی عام قسم کے جملوں میں صراحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثلاً خبر کی بہت غور سے چھان بین کی' پتہ چلا کہ خبر بتانے والے نے سچ بولا (صدق)۔

اس قسم کے جملوں میں بلاشک وشبہ صدق کا معنی زبان کا حقیقت کے مطابق ہونا ہے لیکن صرف یہی مفہوم اس کے مکمل معنی ظاہر نہیں کرتا۔

زبان کی سچائی کو یعنی اس عمل کو جس سے کوئی بات سچ ہو جائے' دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اندرونی سچائی کے طور پر اور معروضی حقیقت کے طور پر۔ معروضی سچائی وہ حقائق ہیں جن سے لفظ مطابقت رکھتے ہوں۔ عربی زبان میں اس معروضی حقیقت کو لفظ حق سے بیان کیا جاتا ہے' جس کے عام معنی بھی سچائی کے ہیں۔ اس طرح لفظ حق سچائی کی معروضی حالت کو ظاہر کرتا ہے' صدق اس کا مخالف قطب ہے۔ یہ خاص طور پر متکلم کی صفت کو بیان کرتا ہے کہ اس کے الفاظ حقیقت کے مطابق ہیں یا نہیں' دوسرے الفاظ میں یہ الفاظ بولنے والا سچا ہے یا نہیں۔ یہ نکتہ ابن اسحاق کی مندرجہ ذیل عبارت سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

واخذ علیهم ان یودو ذلک الی کل من اٰمن بهم

---

(۱) ابن فارس' معجم مقاییس اللغۃ' تحقیق عبدالاسلام ہارون (قاہرہ' ۱۳۶۶-۱۳۷۱ھ)' جلد سوم' ص ۳۳۹

وصدقهم فادّوا من ذلک ما کان علیهم من الحق فیه[1]

(اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے) وعدہ لیا کہ جو کوئی ان پر ایمان لائے گا اور ان کی تصدیق (صدق) کرے گا' یہ امانت اسے پہنچائیں گے۔ چنانچہ ان پر جو سچائی (حق) واجب تھا انہوں نے پہنچایا۔

اسی طرح طرفہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی دلچسپ ہے:

والصدق یالفه اللبیب المرتجی

والکذب یالفه الدنی الاکیب[2]

سچائی ایسے شخص کی مستقل صفت ہے جو مستقل مزاج اور قابل بھروسہ ہو اور جھوٹ ایسے شخص کی صفت ہے جو بدسرشت اور دھوکے باز ہو۔

اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض عرب ماہرین لغات صدق کی معنویاتی ساخت کے بارے میں بعض دور کی کوڑیاں لائے ہیں۔ مثلاً کسی عبارت کے سچا ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ لفظ حقیقت کے مطابق ہوں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اس حقیقت کے مطابق بھی ہوں جو متکلم کے ذہن میں ہیں۔ صدق کی معنویاتی ساخت میں فیصلہ کن عنصر یہ ہے کہ بولنے والے کے ذہن میں اس بات کے سچا ہونے کا ارادہ اور عزم بھی موجود ہو لیکن "حقیقت کے مطابق سچا ہونے کی نیت" کی عبارت کو عملی طور پر مختلف انداز سے سمجھا جاتا ہے اور اس میں جو مفہوم شامل ہوں ان کا دائرہ وسیع بھی ہو سکتا ہے اور تنگ بھی کیونکہ لفظ "حقیقت" کا اطلاق مختلف اشیاء پر ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایک ٹھوس حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ معروف رواج بھی' ادب کا ضابطہ بھی' صلح کا معاہدہ بھی' اور وہ لفظ بھی جو بولے گئے ہیں۔ ان تمام مثالوں میں صدق میں ظاہر طور پر اخلاص' استقلال' امانت اور دیانت کے مفہوم بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہمیں صدق کے عملی استعمال کی ایسی بہت

(۱) سیرہ ابن ہشام' ج ا' ص ۲۵۲

(۲) طرفہ' دیوان' تحقیق م۔ سلگ سوہن (پریس ۱۹۰۱ء) قصیدہ ۴' شعر ۷

سی مثالیں ملتی ہیں جو عربی ادب میں دوسری جگہ بھی پائی جاتی ہیں،جس سے صدق کا مفہوم صرف سچ بولنا کافی معلوم نہیں دیتا۔

صرف ہمارے موجودہ باب کے مخصوص موضوع کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عام مفہوم میں بھی سب سے اہم مثال وہ ہے جہاں قرآن کریم نے صادق بمقابلہ کافراور منافق کا استعمال کیا ہے۔

واذ اخذنا من النبيين ميثاقهم ومنک ومن نوح وابراہيم وموسٰی وعيسی بن مريم واخذنا منهم ميثاقاً غليظاً يسئل الصادقين عن صدقهم واعد للكفرين عذاباً اليماً۔

(الاحزاب: ۷-۸)

اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے اور عہد بھی ان سے پکا لیا تھا تاکہ سچ کہنے والوں سے ان کی سچائی کے بارے میں دریافت کرے اور اس نے کافروں کےلیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ دو گروہوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ ایک گروہ صادق لوگوں کا دوسرا کافروں کا۔ صادق وہ ہیں جو اپنی پوری زندگی بڑے استقلال کے ساتھ معاہدے سے پیدا ہونے والے فرائض کو پورا کرتے رہے۔ جبکہ کافر وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ہمیشہ ناشکری کا اظہار کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس معاہدے سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے اور سچے نہیں رہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ صدق کا لفظ اللہ اور بندوں کے درمیان معاہدے کے مخصوص حوالے کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ سیاق و سباق کا تقاضا ہے کہ صادق کا معنی وفادار اور صدق کا معنی وفاداری کیا جائے۔ اگلی آیت میں جہاں صادق منافق کے بالمقابل استعمال ہوا ہے،فعل صدق کا معنی

یوں ہو گا: ان لوگوں نے معاہدوں کو پورا کیا یا وفادار رہے۔

من المومنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا ليجزى الله الصدقين بصدقهم ويعذب المنفقين ان شاء او يتوب عليهم ان الله كان غفورا رحيما (الاحزاب: ٢٣-٢٤)

مومنوں میں کتنے شخص ایسے ہیں کہ اللہ سے جو اقرار انہوں نے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا تاکہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کا بدلا دے اور منافقوں کو چاہے تو عذاب دے' چاہے ان پر مہربانی کرے' بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

قرآن کریم میں صدق کا لفظ جب عدل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مثلاً سورہ الانعام آیت نمبر ۱۵ میں تو وہاں بھی اس کا یہی مفہوم سامنے آتا ہے۔

وتمت كلمت ربك صدقاً وعدلاً' لامبدل لكلمته (الانعام: ١١٦)

تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

یہ تعبیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ اگر ہم آیت کے آخری حصے کو جس میں اللہ کے الفاظ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مطلقاً کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ سمجھیں کہ یہ ایک طرح سے صدق کے مفہوم کی ترجمانی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ صدق کا لفظ کلمات الٰہی کے حوالے سے آیا ہے۔ اس کا

سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اس معاہدے کا ایک شریک فریق ہے' اس نے اپنے وعدے کی پابندی کی ہے۔ اس کا دوسرے الفاظ میں یوں مطلب بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ایک بات کہہ دیں تو پھر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یعنی اللہ کے الفاظ ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہیں۔

بہرکیف اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صدق کا یہ معنی کہ کوئی شخص اپنے قول پر پورا اترتا ہے' وہ وفا کے اس مفہوم کے بہت قریب ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ چنانچہ صدق انسان کی ایسی صفت کو بیان کرتا ہے جس سے اس کا وفادار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ اکثر ہمیں ساتھ ساتھ مترادف مفہوم میں ملتے ہیں۔ مثلاً

وانی عاهدت محمدا فلست بناقض ما بینی وبینه ولم
ارمنه الا وفاء مصدقا(۱)

میرا محمد (ﷺ) سے معاہدہ ہے' میرے اور ان کے درمیان جو طے ہوا ہے
میں اسے نہیں توڑوں گا کیونکہ میں نے وفا اور صدق کے علاوہ کچھ نہیں
دیکھا۔

حضرت محمد ﷺ کے ایک ہم عصر شاعر نے اپنے اشعار میں جو جنگ احد کے بعد لکھے گئے' یہ الفاظ اس طرح استعمال کیے:

وعدنا ابا سفیان بدراً فلم نجد
لمیعاده صدقاً و ما کان وافیا(۲)

ہم نے ابوسفیان سے بدر کے موقع پر وعدہ لیا تھا لیکن ہم نے اسے وعدہ کا
سچا نہیں پایا' نہ ہی وہ وفادار نکلا۔

(۱) سیرہ ابن ہشام' ج ۳' ص ۲۳۶ [کعب بن اسد قرظی نے حیی بن اخطب کو یہ جواب دیا جب حیی نے قلعے کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

(۲) سیرہ ابن ہشام' ج ۳' ص ۲۲۳

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ حضرت ابوبکرؓ نے صدق کے بارے میں ایسی ہی بات کہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ (ﷺ) کی وفات کے بعد ان کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو انہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''صدق کا خلاصہ امانت ہے اور کذب کا خلاصہ خیانت''۔ امانت بھی ایک ایسا لفظ ہے جو انسان کی ان خصوصیات کو جن کا تعلق اعتماد اور دیانت سے ہے' بیان کرتا ہے اور خیانت اس کے مقابل بد عہدی' بے وفائی اور بے پروائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اب ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ صدق کس طرح قدیم عرب کے لغوی شعور میں وفاداری اور بھروسے کے تصور کے ساتھ وابستہ تھا اور یہ کہ قدیم بدوی اور اسلامی اخلاقی صفات میں اس کو اعلیٰ مقام کیوں حاصل رہا۔

اب ہم اسی مادے کے ایک اور مشتق لفظ صدیق کی طرف آتے ہیں۔ اس متنازعہ فیہ لفظ کا متعین معنی بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک بات ضرور ثابت ہے کہ یہ صادق کا اسم مبالغہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ صدق کے اعلیٰ ترین ممکنہ درجے کو بیان کرتا ہے تاہم یہ پھر بھی مبہم ہے کیونکہ صدق جیسا کہ ہم جانتے ہیں دو قابل امتیاز پہلوؤں کا نام ہے۔ عرب ماہرین لغت کی عام رائے کے مطابق اس کا تعلق سچ بولنے سے ہے۔ چنانچہ صدیق کا مطلب ایسا شخص ہے جو ہمیشہ سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

صدیق کا لفظ خلیفہ ابوبکرؓ کے لقب کے طور پر بہت معروف ہے اور اس کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔ لیکن اگر اس واقعہ کا بغور مطالعہ کیا جائے جس روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کو یہ لقب ملا تو ہم کسی قدر مختلف تعبیر پر پہنچتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے آسمانوں کی طرف معراج اور رات کو یروشلم کی جانب سفر کے اپنے تجربے کو تفصیل کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بتایا تو جو مسلمان اس بات کو سن رہے تھے ان کے ذہنوں میں اس کی حقیقت کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے' ایک شخص جس کے ایمان نے اس تفصیل کے بارے میں کسی شک کو موقع نہیں دیا' وہ روایت کے مطابق ابوبکرؓ تھے۔ جب رسول

اللہ علیہ وسلم یہ تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ انہوں نے یروشلم میں کیا دیکھا تو صرف ابو بکرؓ یہ کہتے رہے کہ یہ سچ ہے' میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل بتانے کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ابو بکرؓ تم واقعی صدیق ہو۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب ہے کہ صدیق صرف اس شخص کو نہیں کہا جاتا جو سچ بولتا ہو بلکہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی سچائی کی شہادت دے۔ اس روایت کا سچا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے ہمارے زیر بحث موضوع کے لیے ایک کلیدی بات معلوم ہوئی جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے ذہن میں صدیق کا مفہوم کیا تھا۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہ مفہوم کیسے مذکور ہوا۔

قرآن کریم میں یہ لقب حضرت مریم' حضرت ابراہیم' حضرت یوسف اور عمومی معنی میں تمام مومنین کے لیے استعمال ہوا ہے:

"ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل وامه صدیقه کانا یاکلان الطعام" (المائدہ : ۷۵)

مسیح ابن مریم صرف ایک پیغمبر ہیں' ان سے پہلے اور بھی پیغمبر گذرے ہیں اور ان کی ماں سچ بولنے والی ہستی تھیں۔

اس آیت کا سیاق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی اولاد حضرت مریم کے بارے میں تقدیس کے اس عقیدے کی نفی کی جائے جو توحید مطلق کے تصور سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا ہے اور یہ واضح کیا جائے کہ یہ دونوں شخصیات سیدھے سادھے فانی انسان تھے' جو دوسروں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ صرف ایک چیز جس میں وہ عام لوگوں سے مختلف تھے' وہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے رسول تھے اور حضرت مریم انتہائی ممتاز نیک خاتون تھیں۔ صدیقہ کے لفظ کا صحیح معنی کیا سمجھا جائے۔ وہ اس سیاق سے واضح نہیں ہوتا۔ ہم اسے سچ بولنا' امانت اور دیانت اور قابل بھروسہ ہونا کسی بھی مفہوم میں لے سکتے ہیں۔

"یوسف ایها الصدیق افتنا فی سبع بقرات سمان یاکلهن
سبع عجاف وسبع سنبلت خضروا خریبست لعلی ارجع الی
الناس لعلهم یعلمونْ" (یوسف: ٤٦)

یوسف! اے صدیق! آپ ہمیں اس بارے میں بتایئے کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گایوں کو کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات خشک تا کہ میں لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں تو ان کو بھی معلوم ہو جائے۔

عام طور پر اس آیت میں صدیق کا مفہوم سچ بولنے والا لیا جاتا ہے۔ کیا اس لفظ کا معنی بولنے والے کے پچھلے تجربے کے حوالے سے لیا جائے یعنی خوابوں کی تعبیر کے حوالے سے جو حضرت یوسف نے اسے بتلائی تھی اور جو سچ نکلا تھا۔ اس مفہوم میں صدیق کا مطلب ہو گا ایسا شخص جس نے سچ بولا تھا یا اس سے مراد زیادہ عام مفہوم میں خود سچائی کی صفت کو لیا جائے یا پھر اس سے قابل اعتماد اور وفادار شخص کا مفہوم سمجھا جائے۔ بہرکیف اس لفظ کے صحیح معنی کے بارے میں بڑی حد تک غیر یقینی کیفیت پائی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل آیت جس میں حضرت ابراہیم کا ذکر ہے معنویاتی لحاظ سے خاص طور پر اہم ہے کیونکہ ایک طرح سے یہ پوری آیت اس بات کی تفصیل سے وضاحت کرتی ہے کہ آپ کو صدیق کیوں کہا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لفظ صدیق کی تعریف نہیں ہے لیکن اس میں ایسی نشانیاں ضرور پائی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے اخلاقی اور عملی رویے سے اس لقب کا استحقاق انہیں حاصل ہوا۔

"واذکر فی الکتب ابراهیم' انه کان صدیقا نبیا' اذقال لابیه یٰابت
لم تعبد مالا یسمع ولایبصر ولایغنی عنک شیئاً یٰابت انی قد
جاء نی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اهدک صراطاً سویا.
یٰابت لاتعبد الشیطان' ان الشیطان کان الرحمن عصیا یٰابت

انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطان ولیا
قال اراغب انت عن الھتی یٰابراھیم لئن لم تنته لارجمنک
واھجرنی ملیا۔ قال سلم علیک ساستغفر لک ربی انه کان
بی حفیا۔ واعتزلکم وما تدعون من دون الله وادعوا ربی عسی
الا اکون بدعاء ربی شقیا فلما اعتزلھم وما یعبدون من دون
الله وھبنا له اسحٰق و یعقوب وکلا جعلنا نبیا و وھبنا لھم من
رحمتنا و جعلنا لھم لسان صدق علیا" (مریم: ۴۱-۵۰)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے۔ وہ بڑے صدیق نبی تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا' اے میرے باپ تم ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ سنتی ہیں' نہ دیکھتی ہیں اور نہ تمہیں کسی چیز سے بچاسکتی ہیں۔ اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم ہے جو تمہارے پاس نہیں تو تم میرے کہنے پر چلو۔ میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا۔ اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو۔ بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے میرے باپ مجھے ڈر ہے کہ تم پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آجائے' پھر تم شیطان کے ساتھی بن جاؤ۔ باپ نے جواب دیا' کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو۔ اے ابراہیم! اگر تم باز نہ آئے تو میں پتھر مار کے سزا دوں گا۔ تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا تم پر سلام ہو' میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی درخواست کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں تم لوگوں سے اور جن کی تم عبادت کرتے ہو' کنارہ کش ہوتا ہوں۔ میں اپنے رب کی عبادت کروں گا' امید ہے میں اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا۔ پس جب وہ ان لوگوں سے اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے کنارہ کش ہوا تو ہم نے اسے اسحاق اور

یعقوب عطا فرمائے اور دونوں میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔ ہم نے ان کو اپنی رحمت سے عطا کیا اور ہم نے ان کو صدق کی زبان اور بلند نام دیا۔

ان آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو عقیدۂ توحید کے الوالعزم نمائندے کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے جو شرک کی قوتوں میں گھرے ہوئے تھے' وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے ایک نڈر اور پرجوش انسان ہیں جو اپنے مذہب پر آخر دم تک قائم رہتے ہیں' حتیٰ کہ ان کے اپنے والد بھی ان پر دباؤ ڈالتے ہیں اور جلاوطن کر دیتے ہیں تب بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ یہ ہے وہ شخص جو ہر لحاظ سے صدیق کہلانے کا اہل ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس آیت سے ہمیں لفظ صدیق کے بنیادی معنویاتی عناصر کا مزید پتہ چلتا ہے۔ اگلی مثال میں بظاہر یہ لفظ اسی معنی میں عمومی طور پر تمام مومنوں کے لیے آیا ہے۔ لیکن یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں صدیق کا لفظ کافر کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

"والذین آمنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم۔ والذین کفروا وکذبوا باٰتینا اولئک اصحب الجحیم" (الحدید: ۱۹)

جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے تو ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا' وہ دوزخی لوگ ہیں۔

ان آخری دو آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم قرآنی سیاق میں لفظ صدیق ایک ایسے مومن کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے ایمان پر پرجوش طریقے سے قائم رہتا ہے اور کچھ بھی ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدے سے وفاداری متزلزل نہیں ہونے دیتا۔ یہاں صدیق کا معنی محض سچ بولنے والے سے زیادہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے قول کا ذکر اوپر ہوا' اس میں بھی ہم نے دیکھا کہ صدق کذب کے بالمقابل ہے اور اس طرح خیانت کا متضاد ہے۔

چنانچہ اگر صدق ایک غیر متزلزل طریقے سے وعدے، قسم اور معاہدے کی پابندی کا نام ہے تو یہ ایک ایسی اخلاقی صفت پر مشتمل ہے جو فطری طور پر خیانت کو سب سے زیادہ معیوب صفت بنا دیتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی بد عہدی کا فعل بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں یہ صفت پائی جاتی تھی، اس سے کالے ناگ کی طرح نفرت کی جاتی تھی۔

"واما تخافن من قوم خیانه فانبذ الیهم علی سواء. ان الله لایحب الخائنین" (الانفال: ۵۸)

اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہے تو آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے کہ برابر ہو جائیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مندرجہ ذیل آیت میں جس میں حضرت یوسف کی امانت و دیانت کا اقرار عزیز مصر کی بیوی کی زبان سے ادا ہوا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ خائن صادق کے عین متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس سیاق و سباق میں صادق سے مراد ایسا شخص ہے جو آقا اور بندے کے درمیان معاہدے کا وفادار رہتا ہے۔

"قالت امراه العزیز الآن حصحص الحق انا راودته عن نفسه وانه لمن الصدقین ذلک لیعلم انی لم اخنه بالغیب وان الله لایهدی کید الخائنین" (یوسف: ۵۱-۵۲)

عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق ظاہر ہو گیا۔ میں نے ہی اس سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی اور وہ تو یقیناً سچا ہے۔ یہ اس لیے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں خیانت نہیں کی تھی اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

اگر عام سماجی زندگی میں خیانت ایک گناہ کبیرہ ہے یعنی وہ سماجی اخلاقیات جن سے

اسلامی معاشرت میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ سلوک میں اس کے ضوابط کے پابند ہیں تو فطری طور پر اس کا اطلاق انسان کے اس مذہبی اخلاقی رویے پر زیادہ صادق آتا ہے جو اللہ کے ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے خیانت انسان کے ساتھ خیانت سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کی سب سے مخصوص شکل نفاق ہے یعنی ایمان میں غیر سنجیدگی کے ساتھ دوغلے پن کا اظہار۔ کفر جس کے متعلق ہم اوپر بحث کر چکے ہیں کم از کم اپنی مخصوص شکل میں خیانت یا بے وفائی کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدے کا سرے سے انکار ہے یا اللہ تعالیٰ پر ایمان سے کھلم کھلا انکار ہے۔ اس کے برعکس نفاق اسلام کے ہوتے ہوئے تقویٰ کے بھیس میں بد عہدی کا فعل ہے۔

درحقیقت نفاق کے تصور پر ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ منافق وہ شخص ہے جو بظاہر نیک مسلمان نظر آتا ہے لیکن اپنے دل میں وہ کافر رہتا ہے جو خفیہ طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ سے پکی دشمنی رکھتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہو گا کہ ہم نے اوپر جو سورہ الاحزاب کی آیات (۲۳ تا ۲۴) نقل کی تھیں ان میں منافق صادق کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ تاہم چونکہ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے نفاق کا موضوع بے حد اہم ہے اس کے مزید تجزیے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پر آگے چل کر مناسب موقع پر گفتگو کریں گے۔ فی الحال اس فصل کو ختم کرتے ہوئے چند آیات نقل کرتے ہیں جن سے مذہب اور ایمان کے تعلق سے خیانت کے معنوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

> "ولاتکن للخائنین خصیما واستغفر الله ان الله کان غفورا رحیما ولاتجادل عن الذین یختانون انفسهم ان الله لایحب من کان خوّانا اثیما" (النساء: ۱۰۶-۱۰۷)
>
> آپ ان بددیانت لوگوں کی طرف داری نہ کریں۔ اللہ سے استغفار کریں بے شک اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔ آپ ان لوگوں

کی طرف سے جواب دہی نہ کریں جو اپنے ساتھ بد دیانتی کرتے ہیں' بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو غدار اور بہت بڑا گنہگار ہے۔

یہ عبارت کہ "جو اپنے ساتھ بد دیانتی کرتے ہیں" یہ بیان کرتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں' وہ خود اپنے ساتھ بھی خیانت کرتے ہیں کیونکہ بالآخر خیانت کا وبال اپنے ہی سر آپڑتا ہے۔ جہاں تک لفظ خوان کا تعلق ہے جس کا ترجمہ عارضی طور پر غدار کیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خائن کا اسم مبالغہ ہے' جس سے مراد ایسا شخص ہے جو بد عہدی میں انتہا درجہ تک پہنچا ہوا ہے اور جو البیضاوی کے الفاظ میں بد عہدی اور خیانت کے کام کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ مزید برآں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں اس لفظ کو ایک اور لفظ اثیم یعنی گناہ گار کے اضافے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"ان اللہ یدافع عن الذین اٰمنوا۔ ان اللہ لایحب کل خوّان کفور"

(الحج : ۳۸)

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دفاع کرتا ہے' بے شک اللہ تعالیٰ کسی غدار اور کفر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بد عہدی کرنے والے کو اسی شدید لفظ یعنی خوان سے یاد کیا گیا ہے' لیکن اس مرتبہ اس کے لفظ اثیم[1] کے بجائے اس سے زیادہ شدید لفظ کفور استعمال ہوا ہے جو ک ف ر کا مادہ ہے' کا اسم مبالغہ ہے اور جس سے مراد انتہائی اور عادی ناشکرا ہے۔

قرآن کریم میں غدار کے لیے ایک اور لفظ بھی آتا ہے جو خوان سے کسی طرح شدت میں کم نہیں۔ یہ ہے ختار' جو کہ ختر کا اسم تفصیل ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو بد عہدی' بے وفائی میں بہت آگے ہو۔[1] یہ بھی کم اہم بات نہیں کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کفور

---

(۱) اثیم پر آگے چل کر باب ۱ میں بحث کریں گے۔

کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ سورہ نمبر ۳۱ آیت نمبر ۳۲ میں چند ناشکرے لوگوں کا ذکر ہے جن کو سمندر کا طوفان گھیرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اس وقت اپنی دعا میں انتہائی خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جونہی حفاظت کے ساتھ ساحل پر اتر آئیں تو وہ یہ سارا ماجرا بھول جاتے ہیں اور پھر خدا کی دشمنی میں لگ جاتے ہیں۔

"الم تر ان الفلک تجری فی البحر بنعمت الله لیریکم من اٰیته۔ ان فی ذلک لاٰیٰت لکل صبار شکور واذا غشیهم موج کالظلل دعو الله مخلصین له الدین فلما نجّٰهم الی البر فمنهم مقتصد وما یجحد باٰیتنا إلّا کل ختار کفور" (لقمٰن: ۳۱-۳۲)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں اللہ ہی کے فضل سے سمندر میں چلتی ہیں تاکہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے۔ بے شک ہر ایسے شخص کے لیے جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہے' اس میں نشانیاں ہیں۔ اور جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب ان کو اللہ نجات دے کر خشکی پر لے آتا ہے تو ان میں سے بعض اعتدال پر آ جاتے ہیں۔ ہماری آیات کا انکار تو بد عہد اور ناشکرے کرتے ہیں۔

آیت کی صوری ساخت میں متوازی تراکیب کے موازنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ختار اور خوان اگرچہ اپنے مادوں میں قطعاً مختلف ہیں تاہم معنیٰ' ساخت اور جذباتی شدت میں ہر لحاظ سے ممکن ترین مترادف ہیں۔

ہم یہاں یہ ذکر کرنا چاہیں گے کہ اس آیت میں لفظ ختار کی تفسیر میں البیضاوی نہایت دلچسپ بات کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد فداد ہے یعنی سب سے نقصان دہ

(۱) ای ڈبلیو لین: عربی انگریزی لغات (انگریزی) (لندن' ۱۸۶۳-۱۸۹۳ء)' جلد دوم' ص ۷۰۱

غداری کرنے والا اور یہ کہ جو اشخاص یہ افعال کرتے ہیں ان کو غدار اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں جو بالآخر فطری میثاق کے مذہب سے بے وفائی اور بد عہدی کا نام ہے۔ یقیناً یہ ہمارے استدلال کی تائید میں بے حد وقیع شہادت ہے۔ یعنی صدق اور خیانت اپنے بنیادی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان معاہدے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی وفاداری کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جہاں رسمی معاہدے کا صریح ذکر بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی یہ تصور بذات خود موجود ہے اور اس کی وجہ سے یہ الفاظ ایک مخصوص اخلاقی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

حق:

جیسا کہ ذکر ہوا صدق کی معنوی صنف میں ہمیں دو مختلف لیکن باہم مربوط پہلو نظر آتے ہیں' ایک سچ بولنا دوسرے وفاداری۔ گذشتہ بحث میں ہم نے زیادہ تر وفاداری یا ایفائے عہد کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اب ہم دوسرے پہلو کے بارے میں گفتگو کریں گے کہ آیا صحرا کی اس قدیم صفت کے بارے میں اسلام میں کوئی خاص تعلیمات موجود ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں صحرا میں رہنے والے عربوں میں سچائی بہت بڑی صفت خیال کیا جاتی تھی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے یہ بات ساری اقوام میں پائی جاتی ہے۔ انسانی صفات میں یہ سب سے عام اور سب سے سادہ صفت ہے اور اس لحاظ سے اس کے سمجھنے میں کوئی پیچیدگی موجود نہیں۔ تاہم قرآن کریم میں یہ صفت ایک بہت ہی مخصوص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات دفعتہً ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہے جب ہم اس کے منفی پہلو پر غور کرتے ہیں یعنی جھوٹ بولنا۔ یاد رہے کہ ہم پہلے اس اہم نکتہ پر گفتگو کر چکے ہیں کہ سچائی دو قطبوں یعنی صدق اور حق کے درمیان واسطے کا نام ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ حق سچائی کا معروضی پہلو ہے یعنی کسی

زبان میں کوئی لفظ تبھی سچا کہلاتا ہے' جب وہ حقیقت کے مطابق ہو۔ داخلی معنوں میں سچائی الفاظ کے ایسے استعمال کا نام ہے جس میں وہ حق یعنی حقیقت کے مطابق ہو۔ اس نکتے کی اہمیت اس وقت زیادہ واضح ہوتی ہے جب ہم ان معاملات میں سچ بولنے کے مسئلے پر غور کریں جن کا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان مذہبی رشتے کا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے مطابق وحی حق کے سوا کچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ خود مطلق حق ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان دونوں صورتوں میں حق باطل کے بالمقابل آتا ہے' جس کا مطلب ہے ایسا جھوٹ اور فریب جس کی بنیاد ہی نہ ہو۔

اللہ حق و صدق ہے:

"ذلک بان الله هوالحق وان مايدعون من دونه هو الباطل وان الله هو العلى الكبير" (الحج : ٦٢' لقمان : ١٣٠)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور اس کے علاوہ جن چیزوں کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں' وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔

اس آیت میں باطل سے مراد صریحاً وہ بت ہے جن کو زمانہ جاہلیت کے عرب اللہ کا شریک ٹھہرا کر پوجتے تھے اور چونکہ قرآن کریم کی زبان میں بتوں کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسانی ذہن کی پیداوار ہیں' گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں' صرف نام ہیں' جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے یہ واضح ہوتا ہے کہ حق سے مراد واضح طور پر ایسی حقیقت اور ایسی زندہ قوت ہے جو دنیائے وجود میں زندگی اور موت کے عمل میں کارفرما ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل آیت سے خاص طور پر واضح ہوتی ہے جس میں اس عمل کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ کس طرح بنی نوع انسان مٹی سے پیدا ہوتے ہیں' ایک خون کے لوتھڑے کی شکل میں نشوونما پاتے ہوئے ایک خوش شکل بچے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس ساری تفصیل کے بعد کہا گیا

ہے کہ یہ وہی اللہ ہے جس میں انسان کو عدم سے پیدا کرنے کی قدرت ہے' وہی یہ قدرت رکھتا ہے کہ حشر کو قائم کر سکے۔

"ذلک بان الله هو الحق وانه يحيى الموتٰى وانه على كل شيئ قدير" (الحج : ۹)

یہ سب اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور یہ کہ وہی مردوں میں جان ڈالتا ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اگلی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلق کا ذکر ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے معاملات کیسے چلاتا ہے اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کا ثبوت بتایا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کی صفت اس کے تخلیقی عمل سے ہی بہتر طریقے سے سمجھی جا سکتی ہے۔

"قل من يرزقكم من السماء والارض امن يملك السمع والابصار ومن يخرج الحى من الميت ويخرج الميت من الحى ومن يدبر الامر فسيقولون الله فقل افلا تتقون. فذلكم اله ربكم الحق فما ذا بعد الحق الاالضلال فانى تصرفون" (يونس : ۳۲)

آپ ان سے کہئے کہ وہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین میں رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوت دیتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو مردہ میں سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے۔ وہ کون ہے جو یہ سارے انتظام کرتا ہے' وہ ضرور یہ کہیں گے کہ وہ اللہ ہے تو پھر ان سے کہئے کہ پھر تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔ سو اللہ ہی تمہارا حق رب ہے۔ حق کے بعد سوائے گمراہی کے کیا رہ گیا۔ تو تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔

وحی بطور صدق وحق:

"ام يقولون به جنه بل جاء هم بالحق واكثرهم للحق كرهون
ولواتبع الحق اهواء هم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فيهن
بل اتينهم بذكرهم فهم عن ذكرهم معرضون" (المومنون :
٧٠-٧١)

یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے جب کہ وہ حق بات لے کر آیا ہے اور ان میں سے اکثر حق سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو لوگ اس کے اندر ہیں' تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کے لیے نصیحت بھیجی اور وہ اپنے لیے نصیحت سے بھی منہ پھیرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو بعثت کے اولین زمانے میں ان کے زمانے کے ہم وطن ایک قسم کا دیوانہ سمجھتے تھے۔ لفظ مجنون لغوی طور پر اس معنی کا حامل ہے کہ کسی شخص پر غیرمرئی روح یا جنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ جنوں کے وجود کے بارے میں حضرت محمد ﷺ بھی کسی شک میں مبتلا نہیں تھے۔ اس آیت میں بہت شدت سے اس بات کی تردید کی گئی ہے اور یہ صراحت کی گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ مجنون نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ ہیں جو وحی الٰہی لے کر آئے ہیں جو کہ خود سچائی ہے۔ اسی طرح اس سچائی کے بارے میں بھی لوگ مذاق اڑاتے تھے اور اسے سحر یا جادو کہتے تھے۔

"وقال الذين كفروا للحق لما جاء هم ان هذا الاسحر مبين"
(سبا: ٤٣)

اور یہ کافر اس حق کی نسبت جو ان کے پاس پہنچا ہے' یہ کہتے ہیں کہ یہ محض صریح جادو ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کفار کے ان شدید حملوں سے پہلے بعض اوقات حضرت محمد ﷺ خود بھی متزلزل ہو جاتے تھے۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ بعثت کے اولین دنوں میں آپ کو تشویش رہتی تھی اور بعض اوقات اس پراسرار آواز کے اصلی منبع کے بارے میں انہیں شک بھی ہو جاتا تھا جو انہیں پیغام کو پہنچانے کی ہدایت دیتی تھی۔ مندرجہ ذیل دو آیات میں خود اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وحی الٰہی کی سچائی ایسی ہے جس پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔

"الحق من ربک فلا تکن من الممترین" (آل عمران : ۶۰)

یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے' سو تم شبہ کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

"الذین اٰتینٰھم الکتب یعرفونه کما یعرفون ابناء ھم وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون الحق من ربک فلا تکن من الممترین" (البقرہ : ۱۴۵-۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے' وہ اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔ ان سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے حق ہے' سو تم شبہ کرنے والوں میں نہ بنو۔

اسلام اور سچائی:

حضرت محمد ﷺ کے ذریعے جو وحی نازل ہوئی اگر وہ سچائی ہے تو فطری طور پر اسلام جو اس وحی پر مبنی دین ہے' وہ بھی سچائی ہے۔ اس لحاظ سے بھی لفظ حق ہمیشہ باطل کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

"قل ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق۔ قل اللہ یھدی للحق۔ افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لایھدیٓ الا ان

یھدی فما لکم کیف تحکمون" (یونس : ۳۵)

ان سے کہئے کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے جو حق کی طرف راستہ دکھائے۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ ہی حق کی طرف راستہ دکھاتا ہے' پھر جو شخص حق کا راستہ دکھائے' وہ زیادہ پیروی کے لائق ہے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہ دکھائے جب تک اسے کوئی راستہ نہ دکھلائے تو پھر تم کو کیا ہو گیا ہے' تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔

"وقل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" (بنی اسرائیل : ۸۱)

اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گذرا ہو گیا' اور باطل تو ہے ہی گیا گذرا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں لفظ حق یعنی سچائی کو ایک خاص قسم کا مقدس مقام حاصل ہے۔ چنانچہ زبان کا ایسا استعمال جس میں اس تقدیس کی نفی پائی جاتی ہو' اللہ تعالیٰ اور اس کے مذہب کے خلاف کھلی بدزبانی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ قرآن کریم میں کذب یعنی جھوٹ بولنے کو انتہائی گھناؤنا بتایا گیا ہے۔ کافر کی سب سے نمایاں خصوصیات میں سے ایک جھوٹ بولنا ہے۔

کذب اللہ تعالیٰ کے خلاف بدزبانی کا ایک رویہ ہے جو بنیادی طور پر دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی شکل تو یہ ہے کہ انسان اللہ اور اس کی وحی کے بارے میں کھلم کھلا جھوٹ بولے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھے۔ قرآن کریم میں پہلی شکل کے لیے افتراء الکذب کا لفظ آیا ہے اور دوسری کے لیے تکذیب۔ افتراء کا مطلب ہے جھوٹ گھڑنا اور تکذیب کا مطلب ہے کسی چیز کو جھوٹا ٹھہرانا۔ تکذیب جیسا کہ لفظ سے ہی ظاہر ہے' وحی الٰہی کا صاف طور پر انکار ہے۔ اس بات کے ماننے سے انکار ہے کہ جب یہ سچائی اتاری گئی تو صحیح نہیں تھی۔

اس کے ساتھ ہی اس کے بارے میں مذاق اور تمسخر کا عنصر بھی شامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآنی سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ تکذیب ایسے ضدی نافرمانوں کا مخصوص رویہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی کو ماننے سے انکار پر مصر ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں آئی اور اسے پرانے لوگوں کی کہانیاں کہہ کر مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔

"وما تاتيهم من آيه من ايات ربهم الاكانوا عنها معرضين. فقد كذبوا بالحق لما جاء هم. فسوف ياتيهم انبوا ما كانوا به يستهزون" (الانعام : ٤-٥)

اور ان کے پاس اللہ کی نشانیوں میں سے کوئی آئے تو وہ ہمیشہ اس سے منہ ہی پھیرتے ہیں۔ انہوں نے جب بھی حق ان کے پاس آیا' تو سے جھٹلایا۔ سو جلد ہی ان کو خبر مل جائے گی۔ اس چیز کے بارے میں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یستھزون سے وہی مراد ہے جو یکذبون کا معنی ہے۔ چنانچہ تکذیب کے عمل میں جو ذہنی رویہ کارفرما ہے' اس آیت سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ استھزاء یا مذاق ایسے لوگوں کی بنیادی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو نازل شدہ سچائی کا انکار کرتے ہیں۔

جہاں تک افتراء کا تعلق ہے' ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر تکذیب براہ راست خدا کے خلاف بدزبانی کا عمل ہے تو جھوٹ گھڑنا زیادہ لطیف قسم کی بے دینی ہے جو اپنی طرف سے یہ جھوٹی کہانیاں گھڑتی ہے اور یہ دعوی کرتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ افتراء اسی قسم کی جعل سازی کا نام ہے۔ یہ ایک فعل ہے اور عام طور پر لفظ کذب اس کا مفعول آتا ہے۔ جو لوگ افتراء کے مرتکب ہوتے ہیں' وہ کسی طرح بھی ان لوگوں سے کم گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں' کیونکہ اس طرح وہ صریحاً خود اللہ کی آیات گھڑنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ قرآن کریم میں افتراء کو بھی اس طرح قابل مذمت قرار دیا گیا ہے جس طرح تکذیب کو۔

قرآن کریم میں افتراء کا صحیح مفہوم کیا ہے' اس سوال کا جواب سیاق و سباق کے اختلاف کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ افتراء کی نمایاں مثال بت پرستی اور وہ مقدس رسوم ہیں جو جاہلیہ میں بت پرستی سے وابستہ تھیں۔

"ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلہ فی الحیوہ الدنیا وکذلک تجزی المفترین" (الاعراف: ١٥٢)

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو خدا بنایا' ان پر بہت جلد خدا کی طرف سے عذاب نازل ہو گا اور دنیوی زندگی میں ذلت ملے گی اور ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

یہ بات حضرت موسیٰ کی قوم کے بارے میں کہی گئی کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سونے کا بچھڑا بنایا اور اللہ تعالیٰ کی بجائے اس بت کی پرستش کرنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ مفترین کا اشارہ بت پرستوں کی طرف ہے۔ اسلام کی رو سے بت پرستی جھوٹ گھڑنے کی سب سے واضح شکل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض اپنے تخیل کی بنیاد پر عجیب و غریب چیزوں کو ایجاد کیا جائے اور بغیر کسی دلیل کے ان کو حقیقت سمجھا جائے جبکہ دراصل حقیقت صرف خدا کی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں بھی مفتری لفظ بعینہ ان ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

"و الی عاد اخاھم ھودا۔ قال یقوم اعبدو اللہ مالکم من الہ غیرہ ان انتم الا مفترون" (ھود: ٥٠)

اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا' اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو' اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں' تم صرف

افتراء کر رہے ہو۔

جیسا کہ معلوم ہے زمانہ جاہلیت میں زندگی کے لیے تحریم کے بہت سے مفصل اور پیچیدہ ضابطے موجود تھے جن کو روایت تقالید کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ چیز حرام ہے اور یہ چیز حلال۔ حرام اور حلال کا یہ نظام لوگوں پر مقدس بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسلام کے نزدیک بلاشک و شبہ اللہ کے خلاف جعل سازی کی مثال تھی کیونکہ یہ حق صرف اس کو حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے لیے احکام اور ضابطے مذہب کی شکل میں جاری کرے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جاہلیت کے مقدس رسوم و رواج کی اکثر شدید الفاظ میں اللہ کے خلاف بہتان کے طور پر مذمت کی گئی ہے۔

"ولاتقولوا لما تصف السنتكم الكذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب. ان الذين يفترون على الله الكذب لايفلحون" (النحل: ١١٦)

اور جن چیزوں کے بارے میں تمہارا محض جھوٹا زبانی دعوی ہے' ان کی نسبت یوں مت کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے جس کا مطلب ہے تم اللہ پر افتراء باندھ رہے ہو' بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں' کامیاب نہیں ہوں گے۔

"وقالوا هذه انعام وحرث حجر لايطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لايذكرون اسم الله عليها افتراء عليه. سيجزيهم بما كانو يفترون" (الانعام: ١٣٨)

اور اپنے خیال پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مخصوص مویشی ہیں اور مخصوص کھیت ہیں جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں۔ ان کو کوئی نہیں کھا سکتا' سوائے ان کے جنہیں ہم چاہیں۔ یہ مویشی ہیں جن پر سواری حرام ہے' یہ مویشی ہیں جن پر یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ سب باتیں محض اللہ پر افتراء ہیں اور

اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے افتراء کی سزا انہیں دے گا۔

بعض اوقات جادو کو بھی افتراء کہا گیا ہے۔ ذیل کی آیت میں مصری جادوگروں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے فرعون کی موجودگی میں جادو کے میدان میں حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرنے کی خواہش کی تھی۔

"قال لهم موسیٰ ویلکم لاتفتروا علی الله کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتری" (طه: ٦١)

موسیٰ نے ان سے کہا' بدبختو اللہ پر جھوٹ نہ باندھو' کہیں وہ تمہیں عذاب سے نیست و نابود نہ کر دے۔ جو جھوٹ باندھتا ہے' وہ آخر ناکام ہوتا ہے۔

بہرکیف افتراء اور تکذیب جو کہ مذکورہ بالا آیت میں استعمال ہوئے ہیں' قرآن کریم کی رو سے کافروں کے سب سے واضح خصائص پر مشتمل ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث لفظ کفر کے ضمن میں آئے گی۔

صبر:

صبر بمعنی استقلال' برداشت' زمانہ جاہلیت کے صحرائی ماحول میں ایک نمایاں صفت تھی۔ یہ دراصل شجاعت کا ایک حصہ تھی جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ شجاعت کا لازمی حصہ تھی۔ صحرا میں جہاں جینا بھی دشوار ہوتا ہے' ہر شخص کے لیے ہر دم بے حد صبر اور برداشت کا مظاہرہ لازمی ہے۔ اس کی اپنی زندگی اور قبیلے کے وجود کا انحصار اس پر ہے۔ جسمانی قوت یقیناً ضروری تھی لیکن یہ کافی نہیں تھی۔ اس کی تائید میں ایسی قوت کی بھی ضرورت تھی جو انسان کے اندر سے اس کا ساتھ دے۔ اس سے مراد صبر یا کمزور نہ پڑنے والا ایسا عزم ہے جو کچھ بھی ہو جائے انسان کے مفاد کے لیے ہمیشہ لڑتا ہے۔

معنوی طور پر یہ لفظ جزع کا بعینہ متضاد ہے۔ اس کا مطلب ہے' ایسے لوگ جو

مصیبت کو صبر کے ساتھ برداشت نہ کر سکیں اور بہت جلد اپنے جذباتی رد عمل کا اظہار کرنے لگیں۔ اس میں یہ معنی بھی مضمر ہیں کہ صبر روح کی ایسی لازمی قوت کا نام ہے جو شدائد اور مصائب میں اور ہر قسم کی مشکلات میں اپنے مقصد کے حصول میں مستقل مزاجی سے انسان کا ساتھ دے۔[۱] یہ بات بہت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ صبر میدان جنگ میں سپاہی کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ صبر کے بغیر شجاعت کا اظہار بھی ناممکن تھا۔

اسلام نے اس قدیم بدوی خوبی کو بھی اپنی بنیادی صفات میں شامل کر کے اس طرح تبدیل کیا کہ اسے ایک مخصوص مذہبی جہت دے دی یعنی اللہ کے راستے میں صبر۔

زمانہ جاہلیت کی طرح مومنین کو حکم دیا گیا کہ جب کافروں کے ساتھ لڑائی کریں تو میدان جنگ میں صبر سے کام لیں۔

"قال الذین یظنون انھم ملقوا اللہ کم من فئه قلیله غلبت فئه کثیره باذن اللہ واللہ مع الصبرین ولما برزوا لجالوت و جنوده قالوا ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین" (البقرہ : ۲۵۰)

جن لوگوں کو خیال تھا کہ وہ اللہ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں' انہوں نے کہا کتنی مرتبہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ صبر و استقلال والوں کا ساتھ دیتا ہے اور جب وہ جالوت اور اس کے فوجوں کے سامنے آئے تو کہنے لگے' اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر نازل فرمایئے اور ہمارے قدم جمائے رکھئے اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے۔

---

(۱) قرآن کریم کی ایک اور آیت میں یہ دونوں خصوصیات تضاد کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ روز حساب جب کفار کو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو وہ کہیں گے: سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص (ابراہیم : ۲۱) ہم بے صبری کا اظہار کریں یا صبر کریں' ہمارے لیے دونوں برابر ہیں۔ اب ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

”وکاین من نبی قتل معه ربیون کثیر فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل الله وماضعفوا وما استکانوا والله یحب الصبرین“ (آل عمران: ۱٤٦)

اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کی معیت میں بہت سے اللہ والے لڑے سو ان مصائب میں جو اللہ کے راستے میں آئے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزور پڑے اور نہ دبے۔ اللہ تعالیٰ ایسے صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ سپاہیانہ صبر قدرتی طور پر شہادت کے جذبے میں بدل جاتا ہے۔ شہادت درحقیقت ایک ایسی اخلاقی قوت کا نام ہے جو حیران کن بہادری کے ساتھ موت کا سامنا کرنے کی قوت دیتی ہے۔ اور ایمان کے راستے میں آنے والی تمام تکالیف کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں فرعون کے جادوگر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ پوری اولوالعزمی کے ساتھ موسیٰ کے خدا کے وفادار رہیں گے خواہ ان کو کتنے ہی ہولناک عذاب اور تکالیف کا سامنا ہو۔

”قال فرعون إمنتم به قبل ان إذن لکم. ان هذا لمکر مکرتموه فی المدینه لتخرجوا منها اهلها. فسوف تعلمون. لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ثم لاصلبنکم اجمعین قالوا انا الی ربنا منقلبون. وما تنقم منا الا ان امنا بایات ربنا لما جاء تنا ربنا افرغ علینا صبرا وتوفنا مسلمین“ (الاعراف: ۱۲۳-۱۲٦)

فرعون کہنے لگا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آئے۔ بے شک یہ ایک سازش ہے جس پر تم نے اس شہر میں عمل کیا ہے تاکہ تم یہاں کے رہنے والوں کو اس شہر سے باہر نکال دو۔ سو اب تم کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا۔ انہوں نے کہا ہم

اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں اور تو ہم سے صرف اس بات کا بدلہ لیتا ہے کہ جب اللہ کے احکام آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اے رب ہم پر صبر کا نزول فرما۔ اور ہمیں حالت اسلام پر موت دے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ صبر کی حقیقت کا اسلام سے واضح طور پر معنوی تعلق قائم کر دیا گیا ہے۔ اس پر اب ہم قدرے تفصیل سے بات کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ صبر کا تقویٰ یعنی خوف خدا سے بھی بہت قریبی تعلق ہے۔

"قال موسٰی لقومه استعینوا باللہ واصبروا۔ ان الارض للہ یورثها من یشاء من عباده والعاقبه للمتقین" (الاعراف: ۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا' اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے' وہ جسے چاہتا ہے' اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور آخر کامیابی متقین کے لیے ہے۔

مومنین کو جس عذاب کا سامنا ہو گا وہ صرف بدنی سزا نہیں ہے۔ یہ تکلیف تمسخر' مذاق اور کافروں کی دشنام طرازی کی شکل میں بھی پیش آسکتی ہے۔ ان معنوں میں تکذیب جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور غرور اور نخوت کی تمام علامات جن پر ہم نے پچھلے باب میں بحث کی تھی' سب کافروں کی صفات ہیں۔ چنانچہ تکذیب کو بھی مومنین کے لیے ان بہت سی آزمائشوں اور آفات میں شمار کیا جا سکتا ہے' جو شہادت کے جذبے کا تقاضا کرتی ہیں۔

"ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علی ماکذبوا واوذوا حتی اتٰهم نصرنا" (الانعام: ۳٤)

اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا' انہوں نے اس تکذیب پر صبر کیا' ان کو تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حتیٰ کہ پھر ہماری مدد ان تک پہنچی۔

"واصبر علی یقولون واهجرهم هجرا جمیلا وذرنی والمکذبین اولی النعمه ومهلهم قلیلا" (المزمل: ۱۰-۱۱)

اور یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں' اس پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔ اور ان ناز و نعمت میں رہنے والے جھٹلانے والوں کو مجھ پر چھوڑ دو اور ان کو تھوڑی مہلت دو۔

"انه كان فريق من عبادي يقولون ربنا آمنا فاغفرلنا وارحمنا وانت خير الرحمين فاتخذتموهم سخريا حتى انسوكم ذكري وكنتم منهم تضحكون انى جزيتهم اليوم بما صبروا انهم هم الفائزون" (المومنون: ۱۰۹-۱۱۱)

میرے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو کہتے تھے' اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے' ہم پر رحمت فرما تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اڑایا حتیٰ کہ اس نے تمہیں ہماری یاد بھلا دی اور تم ہنسی کیا کرتے تھے۔ ہم نے آج ان کو ان کے صبر کا یہ بدلہ دیا ہے کہ وہ ہی کامیاب ہیں۔

چنانچہ صبر صحیح معنوں میں ایمان کے ایک بنیادی پہلو کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے۔ صبر ایمان کا وہ پہلو ہے جو اس کے ناسازگار حالات میں ظاہر ہوتا ہے' اور یاد رہے کہ تاریخ میں اپنے ابتدائی دور میں اسلام کو ایسے ہی حالات کا واقعتاً سامنا کرنا پڑا۔ مومنین کافروں کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف دنیاوی خواہشات کا انبار تھا۔ چنانچہ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پر عزم مزاحمت کا رویہ اختیار کریں۔ دشمن کے مسلسل حملوں کے خلاف اپنے سچے ایمان پر اسی غیر متزلزل عزم کے ساتھ قائم رہنا صبر کہلاتا ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل تین آیات سے مزید واضح ہوتی ہے۔

"فاصبر على مايقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اليل فسبّحه وادبار السجود" (ق: ۳۹-۴۰)

پس ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کیجئے' سورج نکلنے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اور رات میں بھی تسبیح

کیجئے اور سجدوں کے بعد بھی۔

"واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوہ والعشی یریدون وجھه ولاتعد عینیک عنھم ترید زینه الحیوہ الدنیا" (الکہف: ۲۸)

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ثابت قدم رکھئے جو صبح و شام اللہ کو محض اس کی رضا جوئی کے لیے پکارتے ہیں اور دنیوی زندگی کی زینت کے خیال سے ان سے نگاہیں نہ پھیر لینا۔

"یاایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبرو الصلوہ ان الله مع الصبرین. ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل الله اموات. بل احیاء ولکن لاتشعرون ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات. وبشر الصٰبرین الذین اذا اصابتھم مصیبه قالوا انا لله وانا الیه راجعون" (البقرہ: ۵۳-۵٤)

اے اہل ایمان! صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں' انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں' لیکن تمہیں اس کا احساس نہیں۔ ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف' بھوک' مال و جان اور پیداوار میں کمی سے۔ ایسے صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں' ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

مندرجہ بالا بحث ان تمام قبل از اسلام اخلاقی تصورات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی جنہیں اسلام نے اختیار کیا' اور نئی اخلاقیات کا تصور دے کر سمو لیا۔ لیکن کم از کم ہم چند اہم ترین مثالوں کا ذکر ضرور کر پائے ہیں جن سے اسلام کے اس ابتدائی عہد میں غیراسلامی عناصر

کو اسلام میں اختیار کرنے کے عمل کی وضاحت ہوتی ہے' اسلام کو اپنی طویل تاریخ میں اپنے اسی طرح کے عمل سے ثقافت کی مختلف سطحوں پر کئی مرتبہ گذرنا پڑا جب اسے یونانی' ایرانی اور ہندوستانی تصورات کے ساتھ نپٹنا تھا اور بالآخر جدید مغربی تصورات کے ساتھ بھی اسی عمل سے گزرنا پڑا۔

☆☆☆

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی زیر طبع کتب

نئے ایڈیشن

		قیمت
۱۔	محی الدین ابن عربی/نیا ایڈیشن از ڈاکٹر محسن جہانگیری	200-00 روپے
۲۔	نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ (نئی کتاب) مترجم مولف نسیم احمد فریدی	450-00 روپے

خط لکھ کر اپنی کاپی محفوظ کروالیں

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

2 - کلب روڈ لاہور